www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

September 2013 • No. 442 • Rs. 15

مال زندگی کی ضرورت ہے، مال زندگی کا مقصد نہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

ستمبر 2013

فہرست

امت کا دورِ زوال	2
تسخیرِ کائنات	3
اتباعِ سُبُل	6
اسلام اور عقل	9
اہلِ سنت والجماعت	10
دین اور شریعت	12
ایک پیغمبرانہ پیشین گوئی	15
تہذیب کے دو دھارے	18
انسانی دماغ	37
سمندروں کی سطح	38
حیاتیاتی ارتقا کا نظریہ	40
کم تر اندازہ	42
قابلِ کار انسان	43
سوال و جواب	44

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Mob. 8588822679, 8588822680
Tel. 011-46521511, 41827083,
Fax: 011-45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹15
One year ₹150
Two years ₹ 300
Three years ₹ 450

By Registered Mail:
One year ₹400
Two years ₹ 800
Three years ₹1200
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

امت کا دورِ زوال

قرآن کی سورہ آل عمران میں اہلِ کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ آیت آئی ہے:
وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (3:78) یعنی اہلِ کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی زبانوں کو کتاب کے ساتھ موڑتے ہیں، تاکہ تم اس کو کتاب میں سے سمجھو، حالاں کہ وہ کتاب میں سے نہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، حالاں کہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں، اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں یہود ونصاریٰ کے حوالے سے ایک تاریخی قانون کو بتایا گیا ہے۔ اِس قانون کا تعلق زوال یافتہ امت سے ہے۔ کسی امت کی بعد کی نسلیں جب زوال کا شکار ہوتی ہیں تو اُن میں وہی ظاہرہ پیدا ہوتا ہے جس کا ذکر قرآن کی مذکورہ آیت میں کیا گیا ہے۔

دورِ زوال میں ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی امت خدا کی کتاب کو چھوڑ دے۔ خدا کی کتاب اِس امت کی قومی شناخت بن جاتی ہے، اور کوئی امت اپنی قومی شناخت کو چھوڑنے کا تحمل نہیں کرسکتی۔ اِس لیے زوال یافتہ امت کے لوگ ایسا کرتے ہیں کہ وہ اپنی زوال یافتہ حالت کے جواز کے لیے کتاب الٰہی کی خودساختہ تعبیر وتشریح کرنے لگتے ہیں اور پھر وہ کتاب الٰہی کی اِس خودساختہ تعبیر کو اللہ کی طرف منسوب کردیتے ہیں۔

’’وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، حالاں کہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں‘‘۔ اِس جملے میں ’’قول‘‘ سے مراد سادہ طور پر قول نہیں ہے، بلکہ یہی تعبیری انحراف ہیں، یعنی اپنی غلط روش کے جواز (justification) کے لیے کتاب الٰہی کا حوالہ دینا اور کتاب الٰہی کے الفاظ کی ایسی تشریح کرنا جو دورِ زوال میں اُن کی بگڑی ہوئی روش کے حسب حال ہو۔

تسخیرِ کائنات

انسان کے لیے اللہ کی ایک نعمت وہ ہے جس کو تسخیر کہا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی دو آیتیں یہ ہیں: اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (45:12-13) یعنی اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا، تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔ اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو تمھارے لیے مسخر کر دیا، سب کو اپنی طرف سے۔ بے شک اِس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔

تسخیر کا مطلب ہے کسی چیز کو بزور قابلِ استعمال یا قابلِ انتفاع بنانا۔ اللہ جو پوری کائنات کا خالق ہے، اس نے کائنات کے ہر جز کو قوانینِ فطرت (laws of nature) کا پابند بنا رکھا ہے۔ اِس بنا پر یہ ممکن ہو گیا ہے کہ انسان مخلوقات کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرے۔ خدائی قوانین کے ذریعے کائنات اگر اِس طرح مسخر نہ ہوتی تو انسان کے لیے اس کو استعمال کرنا ناممکن ہو جاتا۔

اِس کی ایک مثال سمندر کی ہے۔ سمندروں کی شکل میں پانی کے جو قدرتی ذخائر ہیں، وہ کرۂ ارض کے تقریباً تہائی حصہ (71 %) پر پھیلے ہوئے ہیں۔ زمین ایک گول کرہ ہے جو مسلسل طور پر گردش کر رہا ہے۔ ایک زبردست قانون پانی کے ذخائر کو زمین پر قائم کئے ہوئے ہے۔

ایک طرف زمین کی غیر معمولی کشش زمین کے ذخائر کو اپنی طرف کھینچے ہوئے ہے، اور دوسری طرف سمندر کے اوپر ہوا کا تقریباً پانچ میل موٹا غلاف ہے جو سمندر کے اوپر دباؤ بنائے ہوئے ہے۔ اِن دو طرفہ اسباب کی بنا پر ایسا ہے کہ سمندروں کی گہرائی میں پانی مسلسل طور پر موجود ہے، ورنہ پورا ذخیرۂ آب اڑ کر فضا میں تحلیل ہو جاتا۔

یہی معاملہ سمندر میں چلنے والی کشتیوں کا ہے۔ یہاں بھی خدا کا مقرر کیا ہوا ایک قانونِ فطرت

کام کررہا ہے۔ یہ ایک آبی قانون ہے جس کو آج کل کی زبان میں ہائڈرواسٹیٹکس (hydrostatics) کہا جاتا ہے جس کا ایک شعبہ بائنسی (buoyancy) ہے۔

بائنسی (buoyancy) سے مراد پانی کا یہ انوکھا قانون ہے کہ جب کوئی چیز پانی میں ڈالی جاتی ہے تو وہ پانی کے اندر جتنی جگہ گھیرتی ہے، اُسی کے بقدر وہاں اَپ ورڈ پریشر پیدا ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں کشتی پانی کی سطح پر تیرنے لگتی ہے:

> Buoyancy: The upward pressure by any fluid on a body partly or wholly immersed therein: it is equal to the weight of the fluid displaced.

تسخیر کا دوسرا واقعہ وہ ہے جس کا تعلق بالائی خلا سے ہے۔ زمین کے اوپر جو وسیع خلا ہے، وہ بہت بڑے بڑے نہایت گرم ستاروں سے بھرا ہوا ہے، اِس لیے اس کو ستاروں کی دنیا (starry universe) کہا جاتا ہے۔ یہ تمام ستارے ہماری زمین سے ایک مقرر دوری پر واقع ہیں۔ یہ مقرر دوری اگر قائم نہ رہے تو ہماری پوری زمین جل کر راکھ ہو جائے۔

زمین کی سطح سے رات کے وقت جب کھلے آسمان کو دیکھا جائے تو اوپر کی فضا میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ستارے نظر آتے ہیں۔ یہ ستارے بہت بڑے بڑے ستارے ہیں، لیکن دوری کی وجہ سے وہ چھوٹے نظر آتے ہیں۔ آنکھ سے دیکھنے میں تقریباً دس ہزار ستارے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ستارے وہ ہیں جو ہماری قریبی کہکشاں (Milky Way) سے تعلق رکھتے ہیں۔

اِس کے علاوہ، وسیع خلا میں بے شمار بڑے بڑے ستارے ہیں جو مسلسل حرکت کررہے ہیں۔ ایک سو بلین سے زیادہ کہکشائیں (galaxies) ہیں اور ہر کہکشاں میں تقریباً ایک سو بلین ستارے پائے جاتے ہیں۔

اِس وسیع عالمِ نجوم کو انسان اپنی فطری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اللہ تعالی نے ہماری دنیا میں ایسے مادی اسباب رکھ دئے جن کو انسان دریافت کرے اور ان کو ترقی دے کر طاقت ور دوربین (telescope) بنائے۔ چناں چہ موجودہ زمانے میں خلائی دوربین کو استعمال کرکے انسان

بے شمار ستاروں اور کہکشاؤں کو دیکھتا ہے۔

سمندروں (اور حیوانات) کے معاملے میں تسخیر کا مطلب یہ تھا کہ انسان قانونِ فطرت کو جانے اور اس کی مدد سے اِن چیزوں کو اپنی ضرورت کے لیے استعمال کرے۔ عالمِ نجوم کے معاملے میں تسخیر کا مطلب اُن کو اپنی ضرورت کے لیے استعمال کرنا نہیں ہے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وسیع عالمِ نجوم کو انسان آلات کی مدد سے دیکھے، وہ ان پر غور وفکر کرے۔ وہ غور وفکر کے ذریعے عالمِ نجوم کو اعلیٰ معرفت کے حصول کا ذریعہ بنائے۔

سمندروں اور حیوانات کی تسخیر انسان کی خدمت کے لیے ہے۔ اور عالمِ نجوم کی تسخیر اِس لیے ہے کہ ان کے ذریعے سے آدمی خالق کی عظمت کو دریافت کرے۔ وہ اُن میں غور وفکر کرکے اپنے لیے معرفتِ اعلیٰ کا رزق حاصل کرے۔

ہندی داں طبقے کے لئے ایک قیمتی تحفہ

''پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ کا جیون''

''سیرتِ رسول'' کا ہندی ترجمہ

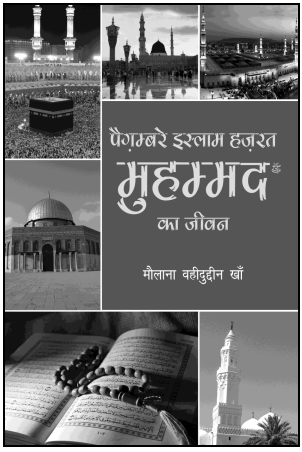

یہ کتاب سیرتِ رسول کا ایک سادہ اور واقعاتی مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو تاریخ وار انداز میں، کسی تشریح یا تعبیر کے بغیر، بیان کیا گیا ہے۔ وہ پیغمبر اسلام کی زندگی کی ایک تاریخی تصویر ہے۔ زیرِ نظر کتاب معلوماتی اسلوب میں سیرتِ رسول کا ایک تفصیلی تعارف ہے۔

اتباعِ سُبُل

قرآن کے مطابق، صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی صراطِ مستقیم پر قائم ہو، اور دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو اتباعِ سبل کہا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (6:154) یعنی یہی میری سیدھی شاہ راہ ہے، پس اِسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستے سے جدا کر دیں گے۔

قرآن کی اِس آیت میں صراطِ مستقیم سے مراد قرآن کی تعلیمات کا وہ صاف اور واضح مفہوم ہے جس کو کسی تاویل کے بغیر ایک انسان سمجھ سکتا ہے۔ اتباعِ سبل سے مراد یہ ہے کہ دور از کار تاویلات کے ذریعے موشگافیاں کی جائیں اور آیات کے نئے معانی نکال کر اُن کو وہ اہمیت دے دی جائے جو کہ اصل دینِ خداوندی میں نہیں ہے۔ یہ طریقہ دراصل غلو کی ایک قسم ہے۔ یہ غلو لوگوں کو ہدایت کے راستے سے ہٹا دیتا ہے۔ چند مثالوں سے اِس مسئلے کی وضاحت ہوگی۔

پہلی صدی ہجری میں خوارج کا ظہور ہوا۔ انھوں نے غلو کر کے دین میں نئے نئے مسئلے بنائے۔ مثلاً قرآن کی سادہ تعلیمات کے مطابق، توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے، لیکن خوارج نے اِس میں خود ساختہ بحثیں نکالیں اور یہ عقیدہ بنا لیا کہ گناہِ کبیرہ کی توبہ نہیں ہے۔ اِس مسئلے پر انھوں نے اتنی زیادہ متشددانہ بحثیں کیں کہ مسلمانوں میں خارجی فرقہ کے نام سے ایک غالی فرقہ وجود میں آ گیا۔ خارجیوں کا یہ طریقہ بلاشبہہ اتباعِ سبل کی ایک مثال ہے۔

اِسی طرح تیسری صدی ہجری میں معتزلہ نے دین میں موشگافیاں کر کے نئے نئے اعتقادی مسئلے نکالے۔ مثلاً قرآن کے بارے میں سادہ اور فطری عقیدہ یہ ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے، لیکن معتزلہ نے خود ساختہ موشگافی (hairsplitting) کر کے یہ نیا سوال کھڑا کیا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ اِس سوال نے اُس زمانے میں اتنی شدت اختیار کی کہ اِس پر دو متحارب گروہ بن گئے۔ یہ اتباعِ سبل کی ایک مہلک مثال تھی۔ اِسی طرح عباسی دور میں فقہ نے جو صورت اختیار کی اور جس کے

نتیجے میں آخرکار، امت کے اندر جامد فرقے بن گئے، یہ معاملہ بھی اِسی اتباعِ سبل کی ایک مثال ہے۔

مسائلِ دین میں فقہی اختلاف اِس لیے پیدا ہوا کہ صحابہ کی روایتوں میں فرق پایا گیا۔ اِس فرق کی توجیہ فقہا نے اِس طرح کی کہ فنی بحثیں کر کے ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح قرار دیا۔ لیکن چوں کہ دونوں مسلکوں کے حق میں صحابہ کی روایتیں موجود تھیں، اس لیے امام شافعی کو یہ کہنا پڑا کہ: رأيي صواب يحتمل الخطأ، ورأي غيرنا خطأ يحتمل الصواب۔ یہ طریقہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے، اتباعِ سبل کی ایک مثال ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امتِ واحدہ امتِ متفرقہ میں تبدیل ہوگئی۔ ابتدائی صورت میں یہ اختلاف، تنوع (diversity) کے ہم معنی تھا، لیکن فقہا کے خود اپنے بنائے ہوئے اصول (الحق لا يتعدد) کے نتیجے میں ایسا ہوا کہ ہر گروہ کے اندر تشدد پسندی آ گئی، ہر گروہ صرف اپنے آپ کو حق پر سمجھنے لگا۔

اِسی طرح بعد کے زمانے کے صوفیا نے غیر اسلامی تصورات سے متاثر ہو کر وحدتِ وجود (monism) کا عقیدہ اسلام میں داخل کیا۔ یہ بلاشبہہ خدا کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم سے انحراف تھا۔ قرآن کے بتائے ہوئے تصور کے مطابق، صحیح عقیدہ وہ ہے جو توحید (monotheism) کے تصور پر قائم ہے، یعنی خدا ایک علاحدہ ہستی ہے اور مخلوقات ہر اعتبار سے اُس سے الگ ہیں۔ وحدتِ وجود کے تصور کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں ہے، وہ تمام تر فلسفیانہ قسم کے مذہبی تصور پر قائم ہے جو اسلام سے باہر خارجی دنیا میں پیدا ہوئے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں مضاہاۃ (9:30) کہا گیا ہے۔

بعد کو شیخ احمد سرہندی (وفات: 1624) نے بظاہر اِس کے رد میں ایک دوسرا تصور پیش کیا جس کو وحدتِ شہود کہا جاتا ہے۔ وحدتِ وجود کی تشریح کے لیے صوفیا نے جو لفظ استعمال کیا، وہ ''ہمہ اوست'' کی اصطلاح ہے، یعنی سب کچھ وہی ہے۔ اِس کے مقابلے میں شیخ احمد سرہندی نے وحدتِ شہود کا جو تصور پیش کیا، اس کے لیے انھوں نے ''ہمہ از اوست'' کی اصطلاح استعمال کی، یعنی سب کچھ اُسی سے ہے۔ مگر وحدتِ شہود کی اصطلاح ایک مبہم اصطلاح ہے، اس سے اصل حقیقت منقح ہو کر

واضح نہیں ہوتی۔ صحیح یہ ہے کہ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود دونوں اصطلاحوں کو ترک کر دیا جائے اور قرآن کے اسلوب میں یہ کہا جائے کہ اِس معاملے میں صحیح اصطلاح توحید کی اصطلاح ہے، یعنی خالق مکمل طور پر الگ ہے اور مخلوق مکمل طور پر الگ۔ دونوں کے درمیان تخلیق کی نسبت ہے، نہ کہ اشتراک کی نسبت۔ اس معاملے میں نئی اصطلاح وضع کرنا خدا کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم سے ہٹنے کے ہم معنی ہے۔

اِسی طرح اِس معاملے کی ایک مثال وہ لوگ ہیں جو خلافت کے انعقاد کو امت کا فرضِ اول قرار دیتے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں امت کے اندر تشدد کا ایک جنگل اگ آیا ہے۔ اِن حضرات کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ نے رسول اللہ کی تدفین پر خلافت کے انعقاد کو مقدم قرار دیا۔ مگر یہ استدلال سرتاسر بے بنیاد ہے۔ مذکورہ معاملے میں صحابہ کا تعامل صرف یہ بتاتا ہے کہ جب امارت یا خلافت کا ادارہ عملاً قائم ہو، اُس وقت ایک امیر کی وفات کے بعد دوسرے امیر کے انتخاب میں تاخیر نہیں کرنا چاہئے، تاکہ قائم شدہ نظم کسی رخنہ کے بغیر برقرار رہے۔

جہاں تک امت کے فرضِ منصبی کا سوال ہے تو وہ صرف ایک ہے اور وہ بلاشبہ پرامن دعوت الی اللہ ہے۔ جہاں تک خلافت یا امارت کا معاملہ ہے، تو وہ حسب ضرورت ایک عملی تقاضا ہے، وہ مطلق معنوں میں امت کا ابدی مشن نہیں۔

کلکتہ میں الرسالہ سے وابستہ افراد کی ماہانہ میٹنگ ہر ماہ کے آخری سنیچر کو ہوتی ہے۔ رابطہ کے لیے ملاحظہ ہو:

Mr. Abdullah: 09831345685,
Imam Shafique Qasmi: 09903708808

دعوتی مقصد کے لیے مشرقی یوپی، خاص طور پر لکھنؤ اور اطراف کے قارئین، حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم کریں:

Hafiz Mohammad Salman Noori
Madrasa S. Umar Farooq, Rustam Nagar, Chawk, Lucknow-226 003
Mob. +91-9839801027, E-mail: msuflko@gmail.com

اسلام اور عقل

اسلام اور عقل ایک قدیم موضوع ہے۔ اِس موضوع پر بہت سی چھوٹی اور بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے علمی ذخیرے میں اِس سلسلے میں جو کتابیں موجود ہیں، اُن میں حسب ذیل چار کتابیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں:

1۔ قواعد الأحکام في إصلاح الأنام (دوجلدیں) عزالدین بن عبدالسلام (وفات: 1262ء)

2۔ إعلام الموقعین (چارجلدیں) ابن القیم الجوزیہ (وفات: 1350ء)

3۔ الموافقات في أصول الشریعة (چارجلدیں) ابواسحاق الشاطبی (وفات: 1388ء)

4۔ حجة الله البالغة (دوجلدیں) شاہ ولی اللہ الدہلوی (وفات: 1763ء)

یہ چاروں کتابیں اپنے موضوع پر بلاشبہہ نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ تاہم ان میں ایک مشترک کمی یہ ہے کہ وہ سب جدید دورِ عقل (modern age of reason) سے پہلے لکھی گئی ہیں۔ قدیم زمانے میں عقلی غور وفکر مبنی بر قیاس ہوتا تھا، موجودہ زمانے میں عقلی غور وفکر مبنی بر سائنس ہوتا ہے۔ اِس طرح اب تعقل کا فریم ورک بدل گیا ہے۔ اب اسلامی عقلیات وہی ہے جو سائنسی فریم ورک کی بنیاد پر تیار کی جائے۔

عقل (reason) کیا ہے۔ علمی تعریف کے مطابق عقل اُس ذہنی صلاحیت کا نام ہے جس کے مقدمات سے نتائج اخذ کیے جائیں۔ پچھلے زمانے میں یہ مقدمات قیاسی ہوا کرتے تھے۔ اب ہم سائنسی مقدمات (scientific premises) کے دور میں ہیں۔ آج کی اسلامی عقلیات وہ ہوگی جس میں سائنسی مقدمات کے ذریعے نتائج اخذ کیے گئے ہوں۔ اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن کی سورہ البقرہ میں قانونِ شہادت کو بتاتے ہوئے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے (2:282)۔

قدیم زمانے میں اِس فرق کا سبب یہ سمجھا جاتا تھا کہ مرد کا تعلق صنفِ قوی سے ہے اور عورت کا تعلق صنفِ ضعیف سے۔ مگر موجودہ زمانے میں جدید تحقیقات نے ہم کو یہ موقع دے دیا ہے کہ ہم اِس فرق کی توجیہہ خالص سائنسی بنیاد پر بیان کرسکیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ماہ نامہ الرسالہ، اپریل 2006، صفحہ: 9-7)

اہلِ سنت والجماعت

''اہلِ سنت والجماعت'' ایک معروف اصطلاح ہے، لیکن اِسی کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ یہ اصطلاح قرآن یا حدیث میں کہیں موجود نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ اصطلاح کب بنی اور کس نے بنائی۔ کسی مستند کتاب میں اس کی واضح تعریف (definition) نہیں ملتی۔ یہ اصطلاح جتنا زیادہ مشہور ہے، اتنا ہی زیادہ وہ غیر واضح بھی ہے۔

''اہلِ سنت والجماعت'' کی محفوظ تشریح یہ ہوسکتی ہے کہ یہ اصطلاح دو مختلف روایتوں سے ماخوذ ہے۔ پہلی روایت وہ ہے جس میں علیکم بسنتي (سنن أبي داود، رقم الحديث: 3993) کے الفاظ ہیں اور دوسری روایت وہ ہے جس میں علیکم بالجماعة (مسند أحمد، رقم الحديث: 22541) کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن روایات کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو مخاطب کرتے ہوئے دو الگ الگ نصیحت کی۔ آپ نے فرمایا کہ تم میری سنت کو لازم پکڑو اور یہ کہ تم ہمیشہ جماعت کو لازم پکڑو۔

''اہلِ سنت والجماعت'' کی اصطلاح میں اگرچہ دونوں تقاضوں کو واؤ عطف کے ذریعے ایک کر دیا گیا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں الفاظ دو مختلف تقاضوں کو بتاتے ہیں۔ علیکم بسنتي سے مراد انفرادی اتباعِ سنت ہے اور علیکم بالجماعة سے مراد یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں جماعت (اکثریت) کا ساتھ دیا جائے۔ اہلِ سنت والجماعت کے اِن دو طرفہ تقاضوں میں دوسرا فرق یہ ہے کہ علیکم بسنتي سے مراد نظری اتباع ہے اور علیکم بالجماعة سے مراد عملی اتباع۔ نظری اتباع کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اصولی اور اعتقادی اعتبار سے، جس بات کو درست سمجھے، اپنی ذات کی نسبت سے اپنی انفرادی زندگی میں وہ اُس پر پوری طرح قائم ہوجائے۔ یہ دین کا وہ پہلو ہے جس پر ایک فرد کی نجات کا انحصار ہے۔ اِس اعتبار سے، علیکم بسنتي کا لفظ ہر مومن کے انفرادی دینی فریضے کو بتا رہا ہے، جب کہ علیکم بالجماعة کی اہمیت عملی (practical) سبب سے ہے، نہ کہ اعتقادی سبب سے۔

اسلام کا خطاب اصلاً فرد سے ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: إنما الأعمال بالنیات (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 1) یعنی عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ نیت (intention) ایک انفرادی چیز ہے۔ نیت کا تحقق ایک فرد کے اندر ہوتا ہے۔ ہر فرد کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کو پوری دیانت (honesty) کے ساتھ اپنی ذاتی زندگی میں اختیار کرے۔ اِس معاملے میں کسی فرد کے لیے مصالحت (compromise) کا طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں۔ ذاتی دین داری کے معاملے میں، کسی فرد سے، معیار سے کم تر کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔

لیکن اجتماعی زندگی کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ اجتماعی زندگی میں معیاری عمل ممکن نہیں۔ انفرادی زندگی میں اگر غیر مصالحانہ رویہ (uncompromising attitude) مطلوب ہے تو اجتماعی زندگی میں اِس کے برعکس مصالحانہ رویہ (compromising attitude) ایک مطلوب چیز بن جاتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں مصالحانہ رویے کی حکمت یہ ہے کہ اگر اجتماعی معاملے میں غیر مصالحانہ رویہ اختیار کیا جائے تو اس سے عملاً خیر کے بجائے شر پیدا ہوگا، جیسا کہ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: الخلاف شر (البیهقي، رقم الحدیث: 5004) یعنی عملی معاملے میں اختلافی روش اختیار کرنا بہ اعتبار نتیجہ شر کا موجب ہوتا ہے۔

اہلِ سنت والجماعت کوئی اعتقادی کلمہ نہیں، وہ زیادہ سے زیادہ ایک حکمت کی بات ہے۔ یہ اصطلاح بتاتی ہے کہ ایک شخص کو محفوظ طور پر دینی زندگی کس طرح گزارنا چاہئے۔ وہ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے معاملے میں آخری حد تک معیار پر قائم رہے، وہ سنتِ رسول کو اپنا ماڈل بنائے۔ لیکن جہاں تک اجتماعی زندگی کی بات ہے، اس میں وہ عملی (practical) بن جائے۔ وہ عملی تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اکثریت کے ساتھ شامل رہے۔ اِسی بات کو دوسرے الفاظ میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ آدمی کو اپنے ذاتی معاملے میں آئڈیلسٹ (idealist) ہونا چاہئے اور اجتماعی معاملے میں پریگمیٹک (pragmatic)۔ اہلِ سنت والجماعت کی اصطلاح کوئی اعتقادی اصطلاح نہیں، وہ قرآن وسنت کی کسی متعین تعلیم پر مبنی نہیں، وہ صرف عمومی تجربے پر مبنی ہے۔ اِس کا تعلق نہ عقیدے سے ہے اور نہ نجات سے۔ وہ صرف ایک کنوینینٹ اصطلاح (convenient term) ہے جو بعد کے زمانے میں رائج ہوئی۔ (20 جولائی 2013)

دین اور شریعت

دین اور شریعت بظاہر یکساں طور پر اسلام کا حصہ ہیں، مگر دونوں کو یکساں طور پر برابر کا حصہ سمجھنا درست نہیں۔ قرآن میں واضح طور پر دونوں کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ یہ فرق ایک حقیقت پر مبنی ہے۔ اِس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غیر ضروری قسم کی غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ "الدّین" تمام نبیوں کے درمیان ہمیشہ ایک رہا ہے۔ الدین کے معاملے میں تمام انبیا کی تعلیمات کے درمیان کوئی فرق نہیں (42:13)۔ دوسری طرف، قرآن میں بتایا گیا ہے کہ شریعت کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ قرآن کے مطابق، مختلف امتوں کو مختلف شریعتیں دی گئیں: لکل جعلنا منکم شرعۃً و منہاجاً (5:48)۔

یہاں یہ سوال ہے کہ دین اور شریعت میں فرق کیوں۔ دین اور شریعت دونوں جب خدا کی طرف سے ہیں تو بظاہر اُن کے درمیان فرق نہ ہونا چاہیے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ دین (بنیادی تعلیمات) کا تعلق حقیقتِ واقعہ سے ہے، اور شریعت (قانون) کا تعلق زمانی حالات سے۔ حقیقتِ واقعہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، اِس لیے جس چیز کا تعلق حقیقتِ واقعہ سے ہو، وہ ہمیشہ اور ہر حال میں یکساں رہے گی۔ لیکن زمانی حالات کا تعلق انسانی سماج سے ہے۔ انسانی سماج میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اِس لیے یہ ضروری ہے کہ شریعت میں زمانے کی رعایت ہو۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو شریعت اور حالات میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے گا اور اصل مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ کے زمانے میں یمن کے ایک شخص مسیلمہ (وفات: 633ء) نے نبوت یا شریکِ نبوت ہونے کا دعوی کیا۔ اس نے اپنے دو سفیروں کو مدینہ بھیجا۔ انھوں نے مسیلمہ کی طرف سے آپ کو یہ پیغام دیا کہ آپ مسیلمہ کی نبوت کو تسلیم کر لیں۔ پیغمبر اسلام نے اِن سفیروں سے پوچھا کہ اِس معاملے میں خود تمھارا کیا خیال ہے۔ انھوں نے کہا کہ اِس معاملے میں ہم مسیلمہ کے ساتھ ہیں۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ:

لو لا أن الرسل لا تقتل لضربتُ أعناقكما (مسند احمد 3/487) یعنی اگر ایسا نہ ہوتا کہ سفیر قتل نہ کیے جاتے تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس واقعے سے ایک اصول اخذ ہوتا ہے، وہ یہ کہ حقوقِ انسانی (human rights) کے معاملے میں اسلام کا اصول بھی وہی ہوگا جو بقیہ دنیا کا متفقہ اصول ہوگا۔ مسلّمہ حقوقِ انسانی کے معاملے میں اسلام بین اقوامی اصولوں (international norms) کا پابند ہوگا۔ موجودہ زمانے کی نسبت سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ موجودہ زمانے میں اقوامِ متحدہ میں مختلف قوموں نے جو حقوقِ انسانی کا منشور (universal declaration of human rights) متفقہ طور پر منظور کیا ہے، وہی عملاً اسلام کا بھی اصول ہے۔

قدیم زمانے میں انسانی حقوق کے معاملے میں مختلف قسم کے فرق ہوتے تھے۔ مثلاً اپنے مذہب والوں کے لیے دوسرا قانون اور دوسرے مذہب والوں کے لیے دوسرا قانون، وغیرہ۔ اِس قسم کے تمام فرق موجودہ زمانے میں اصولاً ختم کر دئے گئے ہیں۔ اب عالمی سطح پر یہ مان لیا گیا ہے کہ حقوقِ انسانی کے معاملے میں تمام انسان، خواہ وہ کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، وہ سب ایک ہی قانون کے ماتحت ہوں گے۔ ایسی حالت میں موجودہ زمانے میں اسلام کا قانون بھی وہی ہوگا جو بقیہ دنیا کا قانون ہے۔

حقوقِ انسانی (human rights) کا تعلق دین سے نہیں ہے، بلکہ شریعت سے ہے۔ جس طرح پچھلے زمانے میں انسانی حالات کے اعتبار سے، مختلف شریعتیں دی گئی ہیں، اِسی طرح موجودہ زمانے میں اگر انسانی حالات بدل گئے ہیں تو شریعت میں بھی اس کے مطابق تبدیلی عین جائز ہوگی۔ اِس معاملے میں قدیم وجدید کے درمیان صرف یہ فرق ہوگا کہ قدیم زمانے میں شریعت میں یہ تبدیلی پیغمبر کے ذریعے ہوتی تھی اور اب موجودہ زمانے میں شریعت کی یہ تبدیلی علما کے اجتہاد کے ذریعے انجام پائے گی۔ قدیم فقہ کے تحت حقوقِ انسانی کے معاملے میں ایک قانونی نظام بنایا گیا تھا۔ اِس قانونی نظام کو عام طور پر شریعتِ اسلامی کا اٹل حصہ سمجھا جاتا ہے، مگر ایسا سمجھنا درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں اِس قسم کے فقہی قوانین اُسی طرح قابلِ تغیر ہیں جس طرح قرآن کے

بیان کے مطابق، شریعتیں قابلِ تغیر ہوا کرتی ہیں۔ خود فقہا نے اِس اصول کو اِن الفاظ میں بیان کیا ہے: تتغیر الأحکام بتغیر الزمان و المکان۔ مثلاً اِسی اصول کی بنا پر موجودہ زمانے میں جزیہ کا حکم ساقط ہوجائے گا اور ہر مذہبی گروہ کے اوپر بلا امتیاز ایک ہی قسم کا ٹیکس نافذ کیا جائے گا۔ اِسی طرح قدیم فقہی تقسیم کے مطابق، دارالاسلام اور دارالحرب کا فرق ختم کردیا جائے گا اور تمام ممالک یکساں قسم کے ملکی قوانین کے تابع قرار پائیں گے، وغیرہ۔

اسلام میں دین اور شریعت کا فرق کوئی سادہ فرق نہیں، یہ فرق ایک اہم حکمت پر مبنی ہے۔ وہ حکمت یہ ہے کہ اگر دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہ کیا جائے تو اسلام کا وہ اصل نشانہ ہی پورا نہ ہوسکے گا جو کہ اسلام کا اصل مقصود ہے۔ دین اور شریعت کے درمیان فرق کی حکمت یہی ہے کہ اسلام کا اصل مقصد فوت نہ ہونے پائے۔ اسلام کا اصل مقصد کسی قسم کے قانون کا نفاذ نہیں ہے، بلکہ انسانی شخصیت کی تعمیر اسلام کا اصل نشانہ ہے۔ اسلام کا اصل نشانہ اسلامائزیشن آف سسٹم (Islamization of system) نہیں، اسلام کا اصل نشانہ اسلامائزیشن آف مین (Islamization of man) ہے۔ اسلام کا پورا نظام اِسی حکمت کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسانی سماج کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ہر دور کے انسان کچھ رواج اور قانون میں اِس طرح کنڈیشنڈ (conditioned) ہوجاتے ہیں کہ وہ اس کے خلاف سوچ نہیں سکتے۔ اِن رواجوں اور اِن قوانین کے خلاف لڑنا عملاً پورے سماج سے لڑنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اِس طرح سماج کے اندر امن کا وہ معتدل ماحول ختم ہوجاتا ہے جس میں کسی انسان کو اپنی شخصیت کی مطلوب تعمیر کا موقع مل سکے۔ یہی حکمت ہے جس کی بنا پر اسلام میں یہ طریقہ مقرر کیا گیا کہ زمانے کے قانونی ڈھانچے کو بزور بدلنے کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ اِس معاملے میں، موجود حالات سے عدم تعرض کے طریقے کو اختیار کیا جائے، تاکہ اسلام کا اصل نشانہ، دعوت اور تربیت اور تزکیہ، کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے۔ اِس معاملے میں، اسلام کے اصول کو ایک لفظ میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ — دین کے معاملے میں، آئڈیل ازم، اور سماجی قانون کے معاملے میں اسٹیٹس کوازم۔

ایک پیغمبرانہ پیشین گوئی

حدیث کی کتابوں میں کئی ایسی روایتیں آئی ہیں جن کا تعلق مستقبل کی پیشین گوئی سے ہے، اسی قسم کی ایک پیشین گوئی وہ ہے جو اِن الفاظ میں آئی ہے: یوشک الأمم أن تداعی علیکم کما تداعی الأکَلَۃُ إلی قصعتہا۔ فقال قائلٌ: و من قلۃٍ نحن یومئذ۔ قال بل أنتم یومئذ کثیر، ولکنکم غثاء کغثاء السیل، ولینزعنّ اللہ من صدور عدوکم المہابۃ منکم، ولیقذفنّ فی قلوبکم الوَہْن۔ قیل وما الوہن یا رسول اللہ۔ قال: حب الدنیا وکراہیۃ الموت (أبو داؤد، رقم الحدیث: 4297) حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ قومیں تمھارے اوپر ٹوٹ پڑیں، جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر ٹوٹتے ہیں۔ ایک شخص نے کہا، کیا اِس لیے کہ اُس وقت ہم لوگ کم تعداد میں ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، اُس وقت تم لوگ بہت زیادہ ہوگے، مگر تم لوگ سیلاب کے جھاگ کی مانند ہوگے، اللہ تمھارے حریف کے دل سے تمھاری ہیبت نکال دے گا، اور تمھارے دلوں میں 'وہن' پیدا کردے گا۔ کہا گیا کہ اے اللہ کے رسول، 'وہن' کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا کی محبت، اور موت کو ناپسند کرنا۔

اِس حدیث میں 'عدو' کا لفظ دشمن یا مقاتل کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ حریف (rival) کے معنی میں ہے۔ 'قصعۃ' بڑے پیالہ (large bowl) کو کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں یہ رواج تھا کہ ایک بڑے برتن میں کھانا رکھ دیا جاتا تھا اور کھانے والے اس کے چاروں طرف بیٹھ کر کھاتے تھے۔ حدیث میں اِس تمثیل کے ذریعے ایک ایسے دور کی پیشین گوئی کی گئی ہے جو بعد کے زمانے میں مسلم دنیا میں آنے والا تھا۔ حدیث کے الفاظ پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ اِس میں معروف قسم کے کسی جنگی حملے کا ذکر نہیں ہے، بلکہ غالباً اُس میں اُس پر امن واقعے کا ذکر ہے جو اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے دوران دنیا میں پیش آیا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے، یہ کوئی جنگی معاملہ نہ تھا، بلکہ آج کل کی اصطلاح میں وہ اقتصادی استحصال (economic exploitation) کا معاملہ تھا۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جب جدید صنعت (modern industry) کا دور آیا تو ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا جس کو کثیر پیداوار (mass production) کہا جاتا۔ اب صنعتی ملکوں کے سامنے یہ سوال تھا کہ اِس فاضل صنعتی پیداوار کو کہاں کھپایا جائے۔ قدیم زمانے میں چیزیں صرف دست کاری کے نظام کے تحت بنتی تھیں۔ دست کار محدود تعداد میں استعمال کی چیزیں بناتا تھا جو کہ مقامی بازار میں فروخت ہوجاتی تھیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں جدید ٹکنالوجی کی بنا پر چیزیں بہت زیادہ مقدار میں بننے لگیں جو کہ مقامی ضرورت سے بہت زیادہ ہوتی تھیں۔

اِس صورتِ حال نے مغربی قوموں کے اندر ایک نئی ضرورت کا احساس پیدا کیا، یعنی اپنی فاضل پیداوار کی کھپت کے لیے بیرونی ملکوں میں مارکیٹ کی تلاش۔ اٹلی کے کرسٹوفر کولمبس (وفات: 1506) اور پرتگال کے واس کوڈی گاما (وفات: 1524) کے بحری اسفار اِسی تجارتی روٹ کی دریافت کرنے کے لیے تھے۔ برٹش کمپنی، فرنچ کمپنی اور ڈچ کمپنی جیسے تجارتی ادارے اِسی مقصد کے لیے بنائے گئے۔ انیسویں صدی (1859-1869) میں سوئز نہر (Suez Canal) اِسی تجارتی توسیع کے لیے بنائی گئی، وغیرہ۔

صنعتی قوموں (industrial nations) کی طرف سے اقتصادی استحصال کے دو بڑے دور ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جو نوآبادیات (colonialism) کے تحت ظہور میں آیا۔ دوسرا دور وہ ہے جو بیسویں صدی میں ظہور میں آیا جب کہ مسلم ملکوں کی زمین کے اندر تیل کے ذخائر دریافت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ تیل کے ذخائر کا 75 فی صد سے زیادہ حصہ مسلم ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ صنعتی قوموں کو اپنی انڈسٹری چلانے کے لیے تیل کی مسلسل سپلائی کی ضرورت تھی۔ اِس مقصد کے لیے انھوں نے مسلم ملکوں پر اپنی بالادستی قائم کی، تاکہ اُن کا صنعتی مفاد کسی روک ٹوک کے بغیر مسلسل باقی رہے۔ 1948 میں اسرائیل کا قیام بھی اسی خاص مقصد سے تھا۔ اس کا محرک ہرگز ''اسلام دشمنی'' نہ تھا، بلکہ صرف اپنے قومی اور تجارتی مفاد کو محفوظ رکھنا تھا۔

تاریخ میں ہمیشہ نئے حالات پیش آتے ہیں۔ یہ نئے حالات گویا ایک نئے قسم کا چیلنج ہیں۔

اُس وقت ضروری ہوتا ہے کہ اِن حالات کے مقابلے میں اپنے موقف کو ازسرِ نو متعین کیا جائے۔ مگر عجیب بات ہے کہ پوری مسلم دنیا، عرب سے عجم تک، اِن حالات کو سمجھ نہ سکی۔ اِس معاملے میں تقریباً تمام مسلمان ردِعمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے حصے میں نفرت اور منفی سوچ اور ٹکراؤ کے سوا اور کچھ نہیں آیا۔ جس کا آخری نتیجہ مایوسی ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی طرف سے خودکش بم باری کے جو واقعات ہو رہے ہیں، وہ مایوسی کی اِسی نفسیات کا نتیجہ ہیں۔

قدیم روایتی ذہن کی بنا پر مسلم رہنما نئے حالات کو سمجھ نہ سکے۔ اِس بنا پر وہ نئے حالات کے مقابلے میں اپنا مثبت موقف متعین نہ کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ نئے حالات نے مسلمانوں کے لیے ساری دنیا میں نئے مواقع کھول دیے تھے۔ یہ نئے مواقع خاص طور پر دو تھے — ایک، یہ کہ اِن قوموں سے سائنس اور جدید ٹکنالوجی کو سیکھا جائے اور ان کے ذریعے اپنے ملکوں کو ترقی کے نئے دور میں پہنچایا جائے۔ موجودہ زمانے میں جاپان اس کی ایک مثال ہے۔ مگر مسلمان ایسا نہ کر سکے۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ اِن قوموں کو مدعو سمجھا جائے اور ان پر دعوت الی اللہ کا کام کیا جائے۔ مزید یہ کہ ان کی پیدا کردہ ٹکنالوجی اور ان کے لائے ہوئے کمیونکیشن کو عالمی دعوت کے لیے استعمال کیا جائے۔ مگر مسلمانوں کی عمومی بے شعوری کی بنا پر یہ کام بھی نہ ہو سکا۔ مسلمانوں کے حصے میں صرف یہ آیا کہ وہ اِن قوموں کو ''دشمن'' سمجھیں اور ان کے خلاف ایک شکایتی گروہ بن کر رہ جائیں۔

بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ یہ واقعات کیوں پیش آئیں گے۔ اِس کا سبب یہ ہوگا کہ اُس زمانے میں مسلمان اپنے دورِ زوال میں پہنچ چکے ہوں گے۔ حدیث میں اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہ 'وَہن' ہے۔ وہن کا لفظی مطلب ہے — ضعف (weakness)۔ یہی داخلی ضعف، نہ کہ کوئی خارجی سازش، اِس صورت حال کا اصل سبب ہوگا۔ امت کے دورِ وہن کو دوسرے الفاظ میں امت کا دورِ زوال کہا جا سکتا ہے۔

تہذیب کے دو دھارے

تہذیب (civilization) کے لفظ سے عام طور پر صرف ایک چیز مراد لی جاتی ہے اور وہ مادی تہذیب ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تہذیب کے دو دھارے ہیں جو مسلسل طور پر تاریخ میں جاری رہے ہیں۔ پہلے دھارے کو مادی تہذیب (material civilization) کہا جاتا ہے۔ دوسرے دھارے کو روحانی تہذیب (spiritual civilization) کہہ سکتے ہیں۔ روحانی تہذیب سے مراد کوئی مبہم چیز نہیں۔ اِس سے مراد عین وہی چیز ہے جو پیغمبروں کی ہدایت کے ذریعے تاریخ میں قائم ہوئی۔ روحانی تہذیب کا لفظ ہم نے صرف اِس لیے استعمال کیا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے قریب الفہم ہے۔

مادی تہذیب کا دھارا ایک دکھائی دینے والا دھارا (visible stream) ہے، اِس لیے ہر آدمی اس سے واقف ہے۔ اِس کے برعکس، روحانی تہذیب کا دھارا ایک نہ دکھائی دینے والا دھارا (invisible stream) ہے، اِس لیے اُس کو صرف گہرے غور و فکر کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے درمیان یہ فرق ایسا ہی ہے جیسے ایک انسان کے وجود میں دو چیزوں کا فرق۔ انسانی وجود کا ایک پہلو اس کا مادی جسم ہے جو پوری طرح دکھائی دیتا ہے۔ اس کے وجود کا دوسرا حصہ روح (soul) ہے جو کہ پوری طرح موجود ہوتی ہے، لیکن بظاہر وہ دکھائی نہیں دیتی۔

مادی تہذیب، مادی امکانیات کو انفولڈ کر کے وجود میں آتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ مادی تہذیب اب سے تقریباً 6 ہزار سال پہلے میسوپوٹامیا (Mesopotamia) کے علاقے میں ابتدائی طور پر شروع ہوئی، پھر وہ ترقی کرتے کرتے موجودہ تکمیلی دور تک پہنچی۔

یہی معاملہ روحانی تہذیب یا اسپریچول تہذیب کا ہے۔ روحانی تہذیب بھی کچھ امکانیات کو انفولڈ کر کے وجود میں آتی ہے، لیکن دونوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ مادی تہذیب کا واقعہ اجتماع یا سوسائٹی کی سطح پر وجود میں آتا۔ اِس کے برعکس، روحانی تہذیب کا واقعہ ایک انفرادی واقعہ ہے اور وہ فرد

کی سطح پر وجود میں آتا ہے۔ فرد کے اندر ذہنی بے داری، فرد کے اندر مقصدِ اعلیٰ کا شعور، فرد کے اندر خدا کے لیے حب شدید اور خوفِ شدید، فرد کے اندر جنت کا اشتیاق، وغیرہ۔

روحانی تہذیب فرد کے اندر مذکورہ قسم کے غیر مرئی (invisible) فکری انقلاب سے شروع ہوتی ہے، پھر وہ ترقی کر کے ربانی شخصیت تک پہنچتی ہے۔ اِس طرح کے افراد ہر دور اور ہر زمانے میں برابر پیدا ہوتے ہیں۔ اِن افراد کی سطح پر روحانی تہذیب کا غیر مرئی دھارا نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ مادی تہذیب اگر اجتماعی اداروں (social organisations) کی سطح پر چلتی ہے تو روحانی تہذیب افراد کی داخلی کیفیات اور افکار کی سطح پر جاری رہتی ہے۔

قرآن کا حوالہ

قرآن تاریخ تہذیب کی کتاب نہیں، لیکن قرآن میں دونوں قسم کی تہذیبوں کے بارے میں اشاراتی حوالے موجود ہیں۔ قرآن کی آیتوں میں تدبر کر کے ان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مادی تہذیب کی بات ہے، اس کا اشاراتی حوالہ قرآن کی سورہ الروم میں اِن الفاظ میں آیا ہے: أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (30:9) یعنی کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا اُن لوگوں کا جو اُن سے پہلے تھے۔ وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے۔ اور انھوں نے زمین کو جوتا اور اس کو اُس سے زیادہ آباد کیا جتنا انھوں نے آباد کیا ہے۔ اور ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے۔ پس اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔

قرآن کی اِس آیت میں ایک خصوصی واقعے کے حوالے سے ایک عمومی قانون کو بتایا گیا ہے۔ اِس قانون کا اشاراتی ذکر آیت کے اِن الفاظ میں ہے: وعمروها أكثر مما عمروها۔ عمومی انطباق کے اعتبار سے، اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر دور میں اپنی بڑھی ہوئی سرگرمیوں کے ذریعے

اپنی زندگی کی مادی تعمیر کرتا رہا ہے۔ اِن سرگرمیوں کے ذریعے ارتقائی طور پر جو محسوس واقعہ ظہور میں آیا، اُسی کا نام مادی تہذیب ہے۔ اِس کے مقابلے میں سرگرمیوں کا دوسرا کلچر جو فرد کی سطح پر جاری رہا، وہی وہ واقعہ ہے جس کو ہم نے روحانی تہذیب کا نام دیا ہے۔ جس طرح مادی تہذیب کا تسلسل تاریخ میں برابر جاری رہا اور جس کا اشارہ قرآن کی مذکورہ آیت میں موجود ہے، اِسی طرح روحانی تہذیب کا غیر مرئی تسلسل بھی تاریخ میں برابر جاری رہا ہے۔ روحانی تہذیب کے تسلسل کا اشاراتی حوالہ قرآن کی سورہ المومنون کے اِن الفاظ میں ملتا ہے: ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا (23:44) یعنی پھر ہم نے لگاتار اپنے رسول بھیجے:

We sent Our messengers in succession.

خدا کے پیغمبر ہر دور میں مسلسل آتے رہے اور ان کی تعلیم و تلقین کے ذریعے تاریخ میں روحانی تہذیب کا غیر مرئی تسلسل قائم رہا۔ مادی تہذیب کا تسلسل اگر اجتماعی سطح پر دکھائی دینے والے مظاہر کی صورت میں قائم رہا تو روحانی تہذیب کا تسلسل افراد کے اندر غیر مرئی احوال کی صورت میں جاری رہا۔

برطانی مورخ آرنلڈ ٹائن بی (وفات: 1975) نے 21 بڑی تہذیبوں کا مطالعہ کیا جن کی مدت تقریباً 5 ہزار سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ اِس مطالعے کے نتائج کو اس نے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں مرتب کیا ہے جو 12 جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Arnold Toynbee, *The Study of History*

مادی تہذیب کے بارے میں اِس طرح کی کتابیں اور اِس طرح کے مقالات بڑی تعداد میں شائع ہوئے ہیں، مادی تہذیب کے تاریخی آثار (monuments) زمین کے مختلف حصوں میں موجود ہیں جو سیاحوں کی دلچسپی کا اہم مرکز ہیں۔ مادی تہذیب کو پروجیکٹ کرنے کے لیے بڑے بڑے میوزیم بنائے گئے ہیں۔ بڑے بڑے ادارے، بڑی بڑی تنظیمیں اور بڑے بڑے شہر گویا اُن کے تعارفی مراکز ہیں۔ اِن مراکز کو دیکھ کر لوگ کہہ پڑتے ہیں — ونڈرفل، ونڈرفل (wonderful, wonderful)۔

اِسی طرح روحانی تہذیب کے واقعات بھی متوازی طور پر موجود ہیں جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے،

مادی تہذیب سے بہت زیادہ بڑے ہیں۔ یہ واقعات پوری تاریخ میں مسلسل طور پر پیش آتے رہے ہیں، لیکن اِن واقعات کے محسوس مظاہر کہیں موجود نہیں، اِس لیے لوگ اُن سے واقف نہیں۔ روحانی تہذیب کے واقعات ہمیشہ افراد کی سطح پر ان کی داخلی دنیا میں غیر مرئی طور پر پیش آتے ہیں۔ یہ افراد اگرچہ انسانی تاریخ کے اعلیٰ ترین افراد ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنی طبیعی عمر پوری کرکے اِس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ان کی پیدا کردہ روحانی تہذیب کو نہ ان کی زندگی میں لوگ دیکھ پاتے اور نہ ان کی وفات کے بعد۔

اسپریچول تہذیب کے اجزا

مصر کے بادشاہوں نے 2300-2700 قبل مسیح کے درمیان مصر میں بڑی بڑی سنگی عمارتیں بنائیں جو اہرام (pyramids) کے نام سے مشہور ہیں۔ ہندستان کے بادشاہ شاہ جہاں نے 48-1630 عیسوی کے درمیان آگرہ (یوپی) میں تاج محل بنوایا۔ اِس طرح کی ہزاروں عمارتیں ہیں جو مادی تہذیب کے تاریخی مظاہر کے طور پر دنیا کے مختلف ملکوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسپریچول تہذیب کے تحت جو واقعات ظہور میں آئے، اُن کا ریکارڈ کہاں ہے۔ کیا وہ اِسی لیے تھے کہ وقتی ظہور کے بعد وہ معدوم ہوجائیں اور ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں۔ یہ تاریخ انسانی کا سب سے بڑا سوال ہے۔

مثال کے طور پر آدم کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان ایک معاملے پر نزاع ہوئی۔ قابیل سخت غصہ ہوگیا۔ اس نے کہا کہ میں تم کو مار ڈالوں گا۔ اِس کے جواب میں ہابیل نے کہا: لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (5:28) یعنی اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لیے تم پر اپنا ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو سارے جہان کا رب ہے۔

چناں چہ ہابیل قتل ہوگیا، مگر اس نے اپنے بڑے بھائی قابیل پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اُس وقت ہابیل کے سینے میں خوفِ خدا کا جو طوفان آیا ہوگا، وہ بلاشبہہ اہرامِ مصر اور تاج محل جیسی عمارتوں سے

بے شمار گنا زیادہ بڑا واقعہ تھا۔ فرشتوں نے یقیناً اس کو ریکارڈ کیا، لیکن انسان کی آنکھوں نے کبھی اِس واقعے کو نہیں دیکھا۔ کیا یہ عظیم ربانی واقعہ صرف اس لیے تھا کہ وہ ایک شخص کے دل میں پیدا ہو اور ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے۔

اِسی طرح چار ہزار سال پہلے جب پیغمبر ابراہیم نے ایک خدائی منصوبے کے تحت اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسا دیا۔ اُس وقت ہاجرہ نے پیغمبر ابرہیم سے پوچھا کہ کیا خدا نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ اس کے بعد ہاجرہ کی زبان سے نکلا: إذن لا یضیّعنا (پھر اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا)۔ صحرا کے اِس بے آب و گیاہ ماحول میں جب ہاجرہ نے یہ الفاظ کہے ہوں گے، اُس وقت ان کے دل میں اعتماد علی اللہ کا ایک عظیم کیفیاتی طوفان برپا ہوا ہوگا۔ یہ طوفان بلاشبہ مصر کے اہرام اور آگرہ کے تاج محل سے بے شمار گنا زیادہ بڑا واقعہ تھا۔ یہ واقعہ بلاشبہہ فرشتوں کے ریکارڈ میں آیا، لیکن انسان کے لیے وہ ایک ناقابلِ ذکر واقعہ بنا رہا۔ کیا یہ عظیم ربانی واقعہ اِسی لیے پیش آیا کہ وہ ایک فرد کے دل میں برپا ہو، اِس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے۔

اِسی طرح ایک واقعہ وہ ہے جو تقریباً تین ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ کے زمانے میں پیش آیا۔ قرآن میں اِس واقعے کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ اُس وقت کے بادشاہ فرعون نے مصر کے ماہر جادوگروں کو بلایا، تاکہ وہ حضرت موسیٰ کے معجزے کا مقابلہ کریں۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق، ایک میدان میں اہلِ مصر بڑی تعداد میں اکٹھا ہوئے۔ وہاں جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں پھینکیں۔ لوگوں کو نظر آیا کہ وہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن کر میدان میں چل رہی ہیں۔ اُس وقت حضرت موسیٰ نے اپنا عصا میدان میں ڈالا۔ حضرت موسیٰ کا عصا اژدہا بن کر جادوگروں کے سحر کو نگل گیا۔

جادوگروں نے جب اِس واقعے کو دیکھا تو اُن پر ظاہر ہو گیا کہ اُن کا کیس جادو کا کیس تھا، لیکن موسیٰ کا کیس اِس سے مختلف کیس ہے۔ وہ رب العالمین کے پیغمبر کا کیس ہے۔ اِس صداقت کے ظاہر ہوتے ہی جادوگروں نے اپنی غلطی کو مان لیا۔ وہ پکار اٹھے: آمَنَّا بِرَبِّ هَارُوْنَ وَمُوْسَى (20:70)۔ فرعون جادوگروں پر سخت غضبناک ہوا۔ اس نے ان کے قتل کا حکم دے دیا، لیکن

جادوگر اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ اِس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، اس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (20:72) یعنی جادوگروں نے کہا کہ ہم تجھ کو ہرگز اُن دلائل پر ترجیح نہیں دیں گے جو ہمارے پاس آئے ہیں اور اُس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ پس تم کو جو کچھ کرنا ہے، اُسے کر ڈالو۔ تم جو کچھ کر سکتے ہو، اِسی دنیا کی زندگی کا کر سکتے ہو۔

مصر کے جادوگروں نے یہ جملہ موت کی قیمت پر کہا تھا۔ اُس وقت اُن کے دل میں سچائی کا جو طوفان برپا ہوا ہوگا، وہ بلاشبہہ اہرامِ مصر اور تاج محل جیسی سنگی عمارتوں سے بے شمار گنا زیادہ عظیم ہے۔ کیا سچائی کا یہ طوفان صرف اِس لیے تھا کہ وہ کچھ انسانوں کے سینے میں وقتی طور پر برپا ہو اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کا وجود مٹ جائے۔

اِسی طرح کا ایک واقعہ وہ ہے جو صحیح البخاری کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے۔ قدیم زمانے میں بنی اسرائیل کے تین صالح افراد ایک سفر پر روانہ ہوئے۔ درمیان میں بارش آ گئی۔ چناں چہ انھوں نے پہاڑ کے ایک غار میں پناہ لی۔ اُس وقت وہاں لینڈ سلائڈ (landslide) کا ایک واقعہ ہوا۔ اس کی وجہ سے غار کا منہ بند ہو گیا۔ یہ پتھر اتنا بڑا تھا کہ تینوں آدمی مل کر بھی اس کو ہٹا نہیں سکتے تھے۔ اُس وقت انھوں نے طے کیا کہ ہر ایک اپنے کسی خاص عمل کے واسطے سے دعا کرے۔ چناں چہ انھوں نے دعا کی اور پتھر ہٹ گیا، پھر وہ لوگ غار سے باہر نکل آئے۔

اِن تینوں میں سے ایک شخص وہ تھا جس نے دعا کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ، میں مزدوروں سے کام لیا کرتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک مزدور کسی بات پر غصہ ہو گیا۔ وہ اپنی مزدوری لیے بغیر چلا گیا۔ اِس کے بعد میں نے اس کی مزدوری کی رقم سے ایک گائے خریدی۔ اِس گائے میں اتنی برکت ہوئی کہ دھیرے دھیرے گائے اور بکری اور اونٹ کا ایک بہت بڑا گلّہ اکھٹا ہو گیا۔ ایک عرصے کے بعد وہ مزور دوبارہ آیا اور اپنی مزدوری کا تقاضا کیا۔ اُس وقت میرے گھر کے سامنے کا میدان جانوروں کے گلے سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ سب تمھارا ہے، اِس کو لے جاؤ۔ مزدور نے کہا کہ مجھ سے استہزا نہ کرو۔ میں نے کہا کہ

یہ استہزا کی بات نہیں، یہ سب تمھاری مزدوری کی رقم کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد وہ مزدور اُن تمام جانوروں کو ہنکا کر لے گیا اور ایک بھی نہ چھوڑا۔ میں نے مزدور کو نہیں روکا اور اُس پر راضی رہا۔ (صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، حديث الغار، رقم: 3465)

اُس آدمی نے جب یہ فیصلہ کیا تو اُس وقت اس کے سینے میں دیانت داری (honesty) کا ایک عظیم طوفان برپا ہوا ہوگا۔ یہ واقعہ بلاشبہہ اہرامِ مصر اور تاج محل جیسی سنگی عمارتوں سے بے حساب گنا زیادہ بڑا تھا۔ کیا یہ واقعہ محض اِس لیے ہوا کہ وہ صرف ایک شخص کے سینے میں برپا ہوا اور پھر ہمیشہ کے لیے معدوم ہوجائے۔ اِس طرح کے واقعات جو افراد کی زندگی میں داخلی طور پر پیش آئے، ایسے کسی واقعے کو اُس فرد نے تو یقیناً جانا جس کو اس کا تجربہ پیش آیا تھا، لیکن اس کی اپنی ہستی کے باہر اُس کا کوئی وجود دکھائی نہیں دیا، وہ صرف غیر مرئی قسم کا ایک ذاتی احساس بن کر رہ گیا۔ ہر عورت اور مرد شعوری یا غیر شعوری طور پر چاہتے ہیں کہ اُن کے داخلی احساسات خارجی واقعہ بن کر نمایاں ہوں۔ جو کچھ انھوں نے وقتی طور پر محسوس کیا تھا، وہ اُسی طرح تاریخ کا مستقل حصہ بن جائے جس طرح دوسری بہت سی چیزیں تاریخ کا مستقل حصہ بنی ہوئی ہیں۔

یہ ایک سوال ہے اور قرآن کے مطالعے سے اِس کا واضح جواب معلوم ہوتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل مادی تہذیب ہے جو قیامت کے دن معدوم ہوجائے گی اور جہاں تک روحانی تہذیب کا سوال ہے، وہ اپنی پوری صورت میں ظاہر ہوکر ابدی طور پر اپنا جلوہ دکھاتی رہے گی۔

دو مختلف انجام

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مادی تہذیب کی ترقیاں صرف وقتی ترقیاں ہیں۔ قیامت کا بھونچال مادی تہذیب اور اس کے تمام آثار کو یکسر مٹا دے گا۔ قیامت کے بعد بننے والی دنیا میں اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا (18:46) یعنی مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں۔ اور باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ تمھارے رب کے نزدیک اجر اور امید کے اعتبار سے بہتر ہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں 'زینة الحیاة الدنیا' سے مراد وہی چیز ہے جس کو مادی تہذیب کہا جاتا ہے۔ یہ مادی تہذیب خواہ بظاہر کتنا ہی زیادہ پُررونق ہو، بہر حال وہ وقتی طور پر صرف امتحان کی مدت تک کے لیے ہے۔ قیامت کا بھونچال اس کو پوری طرح مٹا دے گا۔ اِس کے بعد زمین کا وہ حال ہوگا جس کو قرآن میں قاعاً صفصفاً (20:106) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی چٹیل میدان۔

'باقیات الصالحات' کا لفظی ترجمہ ہے: باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ۔ صالح عمل حقیقۃً وہ ہے جو صالح نیت سے کیا گیا ہو۔ 'باقیات الصالحات' دوسرے لفظوں میں کسی عمل کے کیفیاتی حصہ (qualitative content) کا نام ہے۔ عمل کا یہ کیفیاتی حصہ کہاں واقع ہوتا ہے، وہ ایک مرد یا عورت کے داخلی وجود میں واقع ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے قابلِ فہم بنانے کے لیے روحانی تہذیب کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ قیامت کا بھونچال یہ کرے گا کہ انسانی عمل کے کمیاتی حصہ (quantitative content) کو ڈھا دے گا۔ اِس کے بعد انسانی عمل کا صرف کیفیاتی حصہ (qualitative content) باقی رہے گا۔

قرآن میں اہلِ جنت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَة (10:26)۔ اِس آیت میں ''زیادہ'' کا لفظ غالباً اِس معنی میں ہے کہ آخرت میں اہلِ جنت کے ساتھ جو معاملہ ہوگا، وہ صرف یہ نہیں ہوگا کہ ان کے نیک عمل کو قبولیت کا درجہ ملے گا، بلکہ مزید یہ ہوگا کہ عمل کے دوران اُن کے اندر جو اعلیٰ ربانی کیفیات پیدا ہوئی تھیں، وہ خارجی طور پر متشکل ہو جائیں گی۔ یہی خارجی اظہار وہ چیز ہے جس کو ہم نے اسپریچول تہذیب کا نام دیا ہے۔

مادی تہذیب مادی واقعات کے متشکل ہونے سے وجود میں آتی ہے۔ اِس کے برعکس، اسپریچول تہذیب وہ تہذیب ہے جہاں اعلیٰ ربانی کیفیات متشکل ہوں۔ موجودہ دنیا جن قوانین کے تحت بنی ہے، وہاں کمیاتی عمل (quantitative deeds) تو بخوبی طور پر متشکل ہو سکتے ہیں، لیکن کیفیاتی عمل (qualitative deeds) یہاں متشکل نہیں ہو سکتے۔ آخرت کی دنیا کے قوانین بالکل مختلف ہوں گے۔ اِس طرح وہاں یہ ممکن ہو جائے گا کہ ایک کیفیاتی واقعہ بھی اُسی طرح عملی صورت میں

متشکل ہوجائے جس طرح موجودہ دنیا میں کمیاتی واقعہ عملی صورت میں متشکل ہوتا ہے۔

اِس سلسلے میں قرآن کی دو آیتوں کا مزید مطالعہ کیجئے۔ اِن آیتوں کے الفاظ اور ان کا ترجمہ یہ ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (11:15-16) یعنی جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتے ہیں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیتے ہیں۔ اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے دنیا میں جو کچھ بنایا تھا، وہ نابود ہوگیا اور باطل ہوگیا جو کچھ انھوں نے کمایا تھا۔

قرآن کی اِس آیت میں زینتِ دنیا سے مراد تاریخِ انسانی کا وہی ظاہرہ ہے جس کو ہم نے مادی تہذیب کے معروف نام سے بیان کیا ہے۔ اِس مادی تہذیب کی عمر صرف قیامت تک کے لیے ہے۔ اِس کے بعد وہ مٹا دی جائے گی۔ اس کا انجام وہی ہوگا جس کو قرآن کی مذکورہ آیت میں 'حبط ما صنعوا' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی انھوں نے دنیا میں جو کچھ بنایا تھا، وہ نابود ہوگیا (vain are all their deeds)۔

وہ چیز جس کو مادی تہذیب کہا جاتا ہے، وہ گویا کہ اِسی موجودہ دنیا میں اپنے لیے ایک دنیا بنانا ہے۔ یہ بلاشبہہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے خلاف ہے۔ خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، موجودہ دنیا عمل کے لیے بنائی گئی ہے، نہ کہ تعمیرِ جنت کے لیے۔

ایسا کرنے والے لوگ خدا کے منصوبے کے خلاف چل رہے ہیں۔ اُن کی ساری سرگرمیاں خدا کے نزدیک غیر مقبول ہیں، اِس لیے اُن کا وجود صرف اُس وقت تک ہے جب تک اُن کی امتحان کی مدت ختم نہیں ہوتی۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اُن کی بنائی ہوئی یہ مادی دنیا اُسی طرح ختم کردی جائے گی جس طرح غیر منظور شدہ تعمیر (unauthorised construction) کو سرکاری طور پر ڈھا دیا جاتا ہے۔

اسپریچول تہذیب کا دور

قیامت دو دنیاؤں کے درمیان حد فاصل ہے۔ قیامت کا مطلب یہ ہے کہ مادی تہذیب کا دور ختم ہوا اور روحانی تہذیب کا دور شروع ہو گیا۔ اِسی دوسرے دور کو قرآن میں آخرت کا دور کہا گیا ہے۔ اِس دوسرے دور میں یہ ہوگا کہ پوری تاریخ میں بکھرے ہوئے روحانی اجزا (spiritual contents) کو جنت میں یکجا کر دیا جائے، یعنی اسپریچول اجزا کے حامل انسانوں کو بقیہ انسانوں سے الگ کر کے جنت کی معیاری دنیا میں بسا دینا۔ اِسی حقیقت کو قرآن کی ایک آیت میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (21:105)۔

اِس واقعے کا ذکر بائبل میں بھی موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں — پَر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔ صادق زمینوں کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے:

But the descendants of the wicked shall be cut off. The righteous shall inherit the land and dwell in it forever. (Psalm 37:28-29)

اسپریچول تہذیب یا ربانی تہذیب قیامت سے پہلے کی دنیا میں صالح افراد کی سطح پر ظہور میں آئے گی۔ قیامت کے بعد یہ تمام صالح افراد پوری تاریخِ بشری سے منتخب کر کے جنت میں بسا دئے جائیں گے۔ اِس دوسرے دورِ حیات میں ان کی داخلی اسپریچولٹی یا داخلی ربانیت خارجی واقعہ بن کر چمک اٹھے گی۔ جو چیز دنیا کی زندگی میں داخلی کیفیت (inner spirit) ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی تھی، وہ آخرت کے بدلے ہوئے ماحول میں خارجی طور پر دکھائی دینے والا واقعہ بن جائے گا۔ اِسی حقیقت کو قرآن میں نور کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ صالح افراد کی ربانیت جو موجودہ دنیا میں ایک چھپی ہوئی حقیقت بنی ہوئی تھی، وہ آخرت کی دنیا میں ایک دکھائی دینے والی حقیقت بن جائے گی۔ اِس سلسلے میں قرآن کی دو آیتوں کا مطالعہ کیجیے۔

پہلی آیت قرآن کی سورہ الحدید میں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰی نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (57:12) یعنی جس دن تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کی روشنی اُن کے آگے اور ان کے دائیں چل رہی ہوگی — آج کے دن تم کو خوش خبری ہے اُن باغوں کی جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، تم اُن میں ہمیشہ رہو گے، یہ بڑی کامیابی ہے۔

اِسی طرح سورہ الحدید کی ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (57:19) یعنی جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، وہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہے۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، وہی دوزخ والے ہیں۔

اِسی قسم کی ایک آیت قرآن کی سورہ التحریم میں آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (66:8) یعنی اے ایمان والو، اللہ کے آگے سچی توبہ کرو۔ امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے گناہ معاف کردے اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ جس دن اللہ، نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ اُن کی روشنی ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑ رہی ہوگی، وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب، تو ہمارے لیے ہمارے نور کو کامل کردے اور ہماری مغفرت فرما۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

قرآن کی اِن آیتوں میں نور (روشنی) کے دوڑنے کا ذکر لفظی طور پر دوڑنے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ پھیلنے کے معنی میں ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں اُن کا نور دور دور تک پھیلا ہوا ہوگا۔ مزید یہ کہ نور کا لفظ سادہ طور پر روشنی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ اِس معنی میں ہے کہ ان کے عمل کا روحانی حصہ (spiritual content) جو دنیا میں اعلیٰ داخلی تجربے کی حیثیت رکھتا تھا، وہ

آخرت میں متشکل (materialised) ہوکر خارجی طور پر دکھائی دینے لگے۔ بہ الفاظ دیگر، جو چیز دنیا کی زندگی میں صرف غیر مرئی نور کی حیثیت رکھتی تھی، وہ آخرت میں قابلِ مشاہدہ اسپریچول تہذیب کی صورت اختیار کرلے گی۔ مادی تہذیب جس طرح دنیا میں قابلِ مشاہدہ ہے، اسی طرح اسپریچول تہذیب آخرت میں قابلِ مشاہدہ ہوجائے گی۔

مذکورہ آیت میں 'أجرهم ونورهم' کا لفظ نہایت اہم حقیقت کو بتا رہا ہے۔ اِس آیت میں اجر سے مراد جنت کی مادی نعمتیں ہیں اور نور سے مراد وہ تہذیب ہے جو جنت میں ایک روشن واقعہ بن جائے۔ اہلِ جنت ایک طرف 'لكم فيها ما تشتهي أنفسكم' کے بمصداق، جنت کی اعلیٰ نعمتوں سے محظوظ ہوں گے اور دوسری طرف یہ ہوگا کہ ان کے اندر داخلی سطح پر پیدا ہونے والی ربانی کیفیات جو دنیا میں غیر مرئی حقیقت بنی ہوئی تھیں، آخرت میں وہ قابلِ مشاہدہ نور کی صورت میں نمایاں ہوجائیں گے۔ آخرت میں ظاہر ہونے والے اِس واقعے کو نورانی تہذیب یا اسپریچول تہذیب کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

اِسی طرح مذکورہ آیت میں اہلِ جنت کی زبان سے یہ لفظ ادا ہوا ہے: 'أتمم لنا نورنا'۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تونے ہمیں جس اعلیٰ ربانی تجربے کی توفیق دی، وہ دنیا میں غیر مرئی بنا رہا۔ اب آخرت میں تو ہمارے ساتھ یہ مزید احسان فرما کہ اِن داخلی ربانی تجربات کو خارجی واقعے کی صورت میں ظاہر کردے۔ جس طرح مادہ پرست انسان کی داخلی دریافت خارجی طور پر دنیا میں مادی تہذیب کی صورت میں متشکل ہوئی تھی، اُسی طرح اب تو آخرت میں ہماری داخلی ربانی دریافتوں کو خارجی طور پر نورانی تہذیب یا اسپریچول تہذیب کی صورت میں متشکل کردے۔ یہی مطلب ہے مذکورہ آیت میں اتمامِ نور کا۔

آئڈیا کا متشکّل ہونا

خواہ مادی تہذیب کا معاملہ ہو یا اسپریچول تہذیب کا معاملہ، دونوں کی نوعیت اس اعتبار سے یکساں ہے۔ دونوں کا وقوع ابتداءً ایک غیر مرئی آئڈیا (invisible idea) کی صورت میں ہوتا ہے، بعد کو وہ خارجی صورت میں متشکل ہوجاتا ہے۔ یہی معاملہ مادی تہذیب کا بھی ہے اور

یہی معاملہ اسپریچول تہذیب کا بھی۔

اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ مائکل فریڈے (Michael Faraday, d. 1867) ایک برٹش سائنس داں تھا۔ کچھ تجربات کے دوران اُس کے دماغ میں ایک آئڈیا آیا، جو اب اصطلاحی طور پر الیکٹرومیگنٹزم (electromagnetism) کے طور پر معروف ہے۔ یہ آئڈیا فطرت کے اُس قانون کے بارے میں تھا جس کو الیکٹری سٹی (electricity) کہا جاتا ہے۔ اِس آئڈیا کے تحت یہ فارمولا بنایا گیا کہ بجلی کا مطلب ہے — الیکٹران کا بہاؤ:

Electricity means flow of electrons.

وہ چیز جس کو مادی تہذیب کہا جاتا ہے، وہ براہِ ارست یا بالواسطہ طور پر فطرت کے دو قوانین کا نام ہے — روشنی (light) اور حرکت (motion)۔ فطرت کے اِن دو غیر مرئی قوانین نے جب عملی صورت اختیار کی تو اس کے نتیجے میں وہ مرئی ظاہرہ وجود میں آیا جس کو مادّی تہذیب کہا جاتا ہے۔

یہی معاملہ اسپریچول تہذیب کا بھی ہے۔ اسپریچول تہذیب ابتداءً ایک مخفی واقعے کی صورت میں ایک بندہ مومن کے سینے میں غیر مرئی طور پر وجود میں آتی ہے۔ اسپریچول تجربہ کیا ہے، اس کو قرآن کی اِن آیتوں کے مطالعے سے سمجھا جاسکتا ہے: والذين آمنوا أشد حباً لله (2:165)، ولم يخش إلا الله (9:18)، مما عرفوا من الحق (5:38)، وقلوبهم وجلة (23:60)، في أهلنا مشفقين (52:26)، لا تحزن إن الله معنا (9:40)، وغیرہ۔

مذکورہ حوالے ایک مومن کے سینے میں پیدا ہونے والے اسپریچول تموجات کو بتاتے ہیں۔ یہ اسپریچول تموجات (spiritual waves) اپنی حقیقت کے اعتبار سے بلا شبہہ ہمالیائی تموجات تھے، لیکن دنیا کی زندگی میں وہ غیر مرئی واقعہ بن کر رہ گئے۔ یہ خدا کی شانِ رحمت کے خلاف ہے کہ ایک سائنس داں کی مادی معرفت تو مادی تہذیب کی صورت میں متشکل ہو، لیکن ایک مومن کی ربانی معرفت محسوس اسپریچول تہذیب کی صورت میں متشکل نہ ہو۔

قرآن کے مذکورہ بیانات اِسی سوال کا جواب ہیں۔ اِن آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح

سائنس دانوں کی مادی معرفت خارجی طور پر متشکل ہو کر دنیا میں مادی تہذیب کی صورت میں ظاہر ہوئی، اِسی طرح آخرت میں مزید اضافے کے ساتھ یہ ہوگا کہ مومن بندوں کی ربانی معرفت، جو دنیا میں غیر مرئی تھی، وہ آخرت میں خارجی طور پر متشکل ہوگی۔ اِسی واقعے کو قرآن میں نورانی ظہور سے تعبیر کیا گیا ہے اور اِسی واقعے کا دوسرا نام آخرت کی ابدی دنیا میں بننے والی اسپریچول تہذیب ہے۔

دو قسم کے چہرے

قرآن میں مختلف مقامات پر بتایا گیا ہے کہ قیامت میں انسانوں کو چھانٹ کر الگ کیا جائے گا، اہلِ جنت الگ اور اہلِ جہنم الگ۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (3:103) یعنی جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، اُن سے کہا جائے گا کہ کیا تم اپنے ایمان کے بعد منکر ہو گئے، تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کے سبب سے۔

''روشن چہرہ'' سے مراد کیا ہے۔ اِس سے مراد وہی روشن شخصیت ہے جس کی وضاحت اِس سے پہلے ہو چکی ہے۔ ''سیاہ چہرہ'' سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کے چہروں پر سیاہ رنگ لگا دیا جائے گا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی داخلی برائی ظلمت بن کر اُن کے چہرے پر نمایاں ہو جائے گی۔ جس غیر ربانی شخصیت کو وہ اپنی جھوٹی تدبیروں سے اپنے اندر چھپائے ہوئے تھے، وہ ظاہر ہو کر لوگوں کو محسوس طور پر دکھائی دینے لگے گی۔ یہ کوئی پراسرار بات نہیں ہے، یہ وہی بات ہے جو دنیا کی زندگی میں بھی جزئی طور پر مشاہدات میں آتی ہے، چناں چہ کہا جاتا ہے کہ:

Face is the reflection of one's inner personality.

دنیا کی زندگی میں برے لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ اندر سے بالکل غیر سنجیدہ تھے، مگر اوپر سے وہ اپنے آپ کو سنجیدہ ظاہر کرتے تھے۔ وہ جھوٹ اور بددیانتی پر کھڑے ہوئے تھے، لیکن خوب صورت الفاظ کے ذریعے وہ اپنی حقیقت پر پردہ ڈالے ہوئے تھے۔ دل اور دماغ کے اعتبار سے، وہ صرف ایک

دنیا پرست انسان تھے، لیکن اپنے ظاہر فریب رویّے سے وہ آخرت پسندی کے اسٹیج پر پُررونق جگہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ قیامت کے بعد جو آخرت کی دنیا آئے گی، وہاں تمام حقیقتیں اپنی اصل صورت میں ظاہر ہوجائیں گی۔ وہاں ہر عورت اور مرد اپنی اصل داخلی صورت میں نمایاں ہوجائے گا۔ یہی مطلب ہے قیامت میں چہروں کے سیاہ ہونے کا۔

برے لوگ وہاں اِس طرح اٹھیں گے کہ ان کے چہروں پر سخت قسم کی حسرت اور ندامت چھائی ہوئی ہوگی۔ وہ بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہوں گے۔ ان کا احساسِ محرومی ان کے پورے وجود کو بے قیمت بنائے ہوئے ہوگا۔ اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں ان کی کامل مایوسی کی بنا پر ان کا احساس یہ ہوگا کہ وہ حیوان سے بھی زیادہ بے قیمت ہیں۔ ان کی بے بسی کا یہ حال ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں سے چھپانا چاہیں گے، لیکن وہاں انھیں کوئی جگہ نہیں ملے گی جہاں وہ اپنے آپ کو چھپالیں۔

جنت کا معاشرہ

جنت کے معاشرے میں وہ خوش قسمت افراد جگہ پائیں گے جنھوں نے موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو جنتی شخصیت کی حیثیت سے تیار کیا ہوگا۔ جنتی شخصیت کا لفظ کوئی پراسرار لفظ نہیں ہے۔ اِس سے مراد وہ افراد ہیں جو انتہائی معنوں میں بلند فکری (high thinking) کے مالک ہوں۔ یہی وہ اعلیٰ کردار ہے جس کو قرآن میں خُلقِ عظیم (68:4) یا مزکی شخصیت (20:76) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ اعلیٰ شخصیت والا انسان کون ہے، یہ وہ انسان ہے جس نے اپنے آپ کو ہر قسم کے دنیوی محرکات (worldly motivations) سے اوپر اٹھایا، جس نے اپنے آپ کو کامل طور پر متعصّبانہ فکر (biased thniking) سے پاک کیا، جس نے اپنے آپ کو نفس اور شیطان کی ترغیبات سے بچایا، جس نے اپنے اندر اُس انسان کی تعمیر کی جس کو کامپلکس فری سول (complex free soul) کہا جاتا ہے، جس نے دنیا کی زندگی میں یہ ثابت کیا کہ وہ انٹیگر یٹیڈ پرسنالٹی (integrated personality) کا حامل انسان ہے — یہی وہ صفات ہیں جن سے متصف افراد کو ایک لفظ میں، ربانی انسان کہا جاسکتا ہے۔ انھیں صفات کے حامل افراد کو جنت میں آبادکاری کے لیے منتخب کیا جائے گا۔

جنتی شخصیت کی تعمیر

مذکورہ اعلیٰ ربانی صفات پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ صبر ہے۔ صبر کے ذریعے آدمی اِس قابل بنتا ہے کہ وہ مختلف قسم کے غیر موافق احوال کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے اندر جنتی شخصیت کی تعمیر کرے۔ وہ منفی اسباب کے اندر اپنی مثبت سوچ کو مستقل طور پر برقرار رکھے۔ وہ مسائل کو عذر (excuse) نہ بناتے ہوئے اپنا ربانی سفر جاری رکھے۔ اِسی بنا پر قرآن میں کہا گیا ہے کہ صبر کرنے والے جنت کے اعلیٰ مقامات میں جگہ پائیں گے۔ (25:75)

صبر کی اِسی اہمیت کی بنا پر صبر کو اعلیٰ ترین انعام کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ہر عملِ خیر کی لازمی بنیاد ہے۔ اِسی لیے قرآن میں صبر کرنے والوں کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (39:10) یعنی بے شک صبر کرنے والوں کو اُن کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

جسمانی سرگرمیاں، ذہنی سرگرمیاں

انسانی تاریخ کی تصویر اگر یہ ہو کہ اس میں انسان کے جسم (body) کی سرگرمیاں (activities) تو خوب بیان ہوئی ہوں، مثلاً پہلوانی (wrestling) اور باکسنگ (boxing) جیسی سرگرمیاں تفصیل کے ساتھ ریکارڈ کی گئی ہوں، لیکن انسان کے وجود کا دوسرا اہم تر حصہ جس کو ذہن (mind) کہا جاتا ہے، اس کا سرے سے کوئی ذکر نہ ہو، پوری تاریخ میں انسان کی ذہنی سرگرمیاں (intellectual activities) غیر مذکور (unrecorded) ہو کر رہ جائیں تو ایسی انسانی تاریخ کو نہ صرف نامکمل، بلکہ آخری حد تک بے معنی (meaningless) کہا جائے گا۔

یہ فرضی بات نہیں، بلکہ یہ انوکھا واقعہ عملاً مزید اضافے کے ساتھ پوری دنیا میں پیش آیا ہے۔ وہ اِس طرح کہ انسان کی مادی سرگرمیاں مادی تہذیب کی صورت میں متشکل (materialized) ہو کر اپنی پوری صورت میں لوگوں کے سامنے موجود ہیں۔ مادی تہذیب کو ہر آدمی جانتا ہے اور ہر آدمی اس کو دیکھ رہا ہے۔ مادی تہذیب ہر آدمی کے لیے ایک معلوم واقعہ ہے۔ لیکن انسانی سرگرمیوں کی ایک اور قسم

ہے۔اس کو اسپریچول سرگرمیاں (spiritual activities) کہا جاسکتا ہے۔یہ وہ سرگرمیاں ہیں جو انفرادی سطح پر سچے انسانوں کی زندگی میں پیدا ہوئیں۔وہ پوری طرح غیر مرئی (unobservable) تھیں۔افراد کی داخلی زندگی میں مکمل طور پر موجود ہونے کے باوجود وہ ظاہری طور پر کبھی متشکل نہیں ہوئیں۔مثلاً تاریخ کے ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جنھوں نے خدا کو اپنا سول کنسرن (sole concern) بنایا، جن کی سوچ تمام تر سچائی اور دیانت داری پر مبنی تھی، جنھوں نے دنیا کے بجائے آخرت کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا، جن کی آخری آرزو یہ تھی کہ اُن کو جنت میں داخلہ ملے، جنھوں نے خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کو سمجھا اور ان سے تجاوز نہیں کیا، جن کا ربانی شعور اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ ہر وقت داخلی طور پر توبہ واستغفار میں مشغول رہتے تھے۔

یہ تمام اعمال انتہائی اعلی اعمال ہیں، لیکن وہ ہمیشہ کیفیات کی سطح پر پیدا ہوتے ہیں۔اُن کو کمیاتی اصطلاح (quantitative term) میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔یہ ربانی اعمال یا اسپریچول سرگرمیاں افراد کی داخلی دنیا میں پیدا ہوئیں اور پھر افراد کی موت کے ساتھ بظاہر ختم ہوگئیں۔اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ اعلی اسپریچول تہذیب کی حیثیت رکھتی تھیں، مگر اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود وہ کبھی ظاہری طور پر متشکل نہیں ہوئیں جس طرح مادی تہذیب اپنی ظاہری صورت میں متشکل ہوئی۔

آخرت کی دنیا جو قیامت کے بعد آئے گی، وہ اِسی کی تلافی اور تکمیل کے لیے ہے۔قیامت ایک طرف مادی تہذیب کو پوری طرح نابود کردے گی، اگلے مرحلہ حیات میں اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا، دوسری طرف یہ ہوگا کہ آخرت کے موافق ماحول میں ماضی کے اسپریچول واقعات پوری طرح متشکل ہوکر ایک اسپریچول تہذیب کی صورت اختیار کرلیں گے۔

یہ اسپریچول تہذیب ایک ابدی تہذیب ہوگی۔قیامت سے پہلے کے دورِ تاریخ میں دونوں قسم کے افراد باہم ملے ہوئے تھے، لیکن قیامت کے بعد کے دورِ تاریخ میں دونوں کو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کردیا جائے گا۔(27:83)

خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) کے مطابق، قیامت سے پہلے کا دورِ حیات

انفرادی اعتبار سے تعمیرِ شخصیت کا دور تھا، وہ اجتماعی اعتبار سے تعمیرِ تہذیب کا دور نہ تھا۔ آخرت کی دنیا میں یہ ہوگا کہ جن افراد نے اپنی شخصیت کی تعمیر نہ کی، وہ رد کردئے جائیں گے اور جن افراد نے اپنی شخصیت کی تعمیر کی، وہ خدا کے مطلوب بندے ٹھہریں گے۔ ایک گروہ کا کیس کامیابی کا کیس ہوگا اور دوسرے گروہ کا کیس ناکامی کا کیس۔ (42:7)

قرآن میں دونوں قسم کے افراد کو مختلف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ کامیاب افراد روشن چہروں (bright faces) والے ہوں گے اور ناکام افراد سیاہ چہروں (dark faces) والے۔ کامیاب افراد ابدی طور پر خوشیوں کی زندگی پائیں گے اور ناکام افراد ابدی طور پر حسرت کی آگ میں جلتے رہیں گے۔

خاتمۂ کلام

اللہ کو مطلوب تھا کہ اسپریچول تہذیب کا تسلسل دنیا کے آغاز سے لے کر اس کے خاتمے تک جاری رہے۔ اللہ نے دیکھا کہ انسان کو دی گئی آزادی کی بنا پر یہ تسلسل مجموعے کی سطح پر جاری نہیں ہوسکتا، اس لئے اللہ نے اس کو افراد کی سطح پر جاری کردیا۔ چناں چہ انسانی مجموعے کی سطح پر اگرچہ اسپریچول تہذیب کا تسلسل جاری نہیں ہے، لیکن افراد کی سطح پر یہ تسلسل مکمل طور پر جاری ہے۔ اِس سلسلے کا پہلا فرد غالباً ابتدائی دور کا ہابیل ابن آدم تھا، جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے (5:27) اور اِس سلسلے کا آخری فرد غالباً دورِ آخر کا وہ رجلِ مومن ہوگا جس کا ذکر صحیح مسلم کی ایک روایت میں آیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2938)

انسان کی آزادی کی بنا پر اس دنیا میں اسپریچول تہذیب کا اجتماعی تسلسل عملاً ناممکن ہے، لیکن اسپریچول تہذیب کا انفرادی تسلسل پوری طرح ممکن ہے اور بلاشبہہ وہ ہر دور میں اور ہر زمانے میں جاری رہا ہے۔ اسپریچول تہذیب کے عملی ظہور کے معاملے کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ آپ ایک وسیع کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں آپ کے سامنے کی میز پر ایک ٹی وی سیٹ رکھا ہوا ہے۔ بظاہر کمرے میں صرف کچھ مادی چیزیں ہیں۔ مثلاً دیوار، کرسی، میز، وغیرہ۔ اِن چیزوں کو آپ دیکھ

رہے ہیں، لیکن اِسی کے ساتھ وہاں ایک اور چیز ہے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتی، مگر وہ مکمل طور پر موجود ہے۔ یہ دوسری چیز غیر مرئی لہروں (invisible waves) کی صورت میں ہے۔ اِس غیر مرئی دنیا میں زندہ انسان ہیں، آوازیں ہیں اور مختلف قسم کی عملی سرگرمیاں ہیں، لیکن بظاہر وہ مکمل طور پر غیر مرئی ہیں۔ اس کے بعد آپ اپنے ٹی وی سیٹ کو آن کرتے ہیں تو اچانک اسکرین پر ایک پوری دنیا نظر آنے لگتی ہے، جو اُسی طرح کامل اور بامعنی ہے جس طرح ٹی وی سیٹ کے باہر کی دنیا۔

اِس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اسپریچول تہذیب کیا ہے۔ وہ کس طرح آج بظاہر غیر موجود ہے اور آخرت کی دنیا میں وہ مکمل طور پر موجود ہوجائے گی۔ آخرت میں پیش آنے والا یہی وہ واقعہ ہے جس کے ایک پہلو کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (41:21)۔

آخرت میں اسپریچول تہذیب کے عملی ظہور کا واقعہ قدیم زمانے میں صرف ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا تھا، مگر موجودہ زمانے میں ٹیلی ویژن کی ایجاد گویا کہ اِس معاملے کا ایک پیشگی مظاہرہ ہے۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد نے اسپریچول تہذیب کے عملی ظہور کو مشاہداتی سطح پر قابلِ فہم (understandable) بنادیا ہے۔ (20 جون 2013)

ممبئی میں حلقہ الرسالہ سے وابستہ افراد کی ماہانہ میٹنگ ہر مہینہ کے پہلے اتوار کو تین بجے حسب ذیل مقام پر ہوتی ہے:

Glow Pharma, 302, A Wing,
Koldongri CHS, Parsi Wada Bus Stop
Sahar Road, Andheri, East Mumbai

چمپارن (بہار) میں عصری اسلوب میں فکر انگیز کتابیں اور ماہ نامہ الرسالہ کے لیے رابطہ قائم کریں:

Kitab Manzil
Jama Masjid, Main Road, Motihari
East Champaran-845401, Bihar
Mob. 09973360552

انسانی دماغ

فطرت کا ایک قانون ہے جس کو ریزیلینس کا قانون (law of resilience) کہا جاتا ہے، یعنی نقصان کی تلافی کرنے کا قانون۔ مثال کے طور پر اسپنج کو اگر دبائیں اور اس کو چھوڑ دیں تو اپنے آپ وہ دوبارہ اپنی سابق حالت پر واپس آجائے گا۔ بید (cane) کو اگر موڑیں اور پھر چھوڑ دیں تو اپنے آپ وہ دوبارہ پہلے کی طرح سیدھا ہوجائے گا۔ ربر کو اگر کھینچا جائے اور پھر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے آپ پہلے کی طرح ہوجائے گا، وغیرہ۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان کو بھی فطری طور پر یہ صلاحیت دی گئی ہے کہ اس کو کوئی نقصان پہنچے تو وہ خود اپنی داخلی صلاحیت کے زور پر دوبارہ اپنی اصل حالت پر واپس آجائے۔ انسان کا دماغ اِس معاملے کی ایک غیر معمولی مثال ہے۔ دماغی سائنس کے ایک امریکی ماہر ڈاکٹر بروس (Bruce) نے لکھا ہے کہ — انسان کا دماغ تلافیِ مافات کی بہت زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو ایک موقع دو اور وہ خود ہر کوشش کرکے اس کو درست کرلے گا:

> The brain is very resilient. Give it a chance and it will make every effort to repair itself. (Dr. Bruce McEwen, Head of Laboratory of Neuroendocrinology, The Rockefeller University, USA)

انسان کی زندگی میں بار بار حادثات پیش آتے ہیں۔ یہ فطرت کا نظام ہے، لیکن اِسی فطرت نے انسان کے اندر تلافی مافات کی بھی غیر معمولی صلاحیت رکھی ہے۔ انسان کے دماغ کو اگر متعصّبانہ سوچ سے بچایا جائے اور اس کو غیر متاثر انداز میں سوچنے کا موقع دیا جائے تو انسان کا دماغ یہ قدرت رکھتا ہے کہ وہ ہر حادثے کے بعد نئی منصوبہ بندی کرکے دوبارہ اس کی تلافی کرلے۔ انسان کی یہ صلاحیت بتاتی ہے کہ انسان کے لیے کوئی عذر (excuse) عذر نہیں۔ انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ہر نقصان کی تلافی کرسکے، وہ ہر مسئلے کا یقینی حل دریافت کرلے۔ وہ ہر پسپائی کے بعد نئی منصوبہ بندی کرکے آگے بڑھ جائے۔

سمندروں کی سطح

تحقیقات بتاتی ہیں کہ سمندروں میں پانی کی سطح مسلسل اونچی ہورہی ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ فضائی حرارت بڑھنے کی بنا پر دنیا میں برف کے ذخیرے پگھل رہے ہیں۔ دنیا میں جگہ جگہ پانی کے منجمد ذخیرے موجود تھے، مگر اب پانی کے اِن ذخیروں میں بہت زیادہ کمی آ گئی ہے۔ یہ برفانی ذخیرے شیریں پانی کے ذخیرے تھے، مگر جب پگھلنے کے بعد وہ سمندر کے پانی میں ملتے ہیں تو وہ بھی کھاری پانی بن جاتے ہیں۔

دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ برفانی ذخیروں کے پگھلنے کی وجہ سے سمندروں کے پانی کی سطح اونچی ہورہی ہے۔ یہ بے حد خطرناک بات ہے۔ حالیہ تحقیقات کے بعد ماہرین نے اندازہ کیا ہے کہ اگر تمام دنیا کے گلیشیر پگھل جائیں تو اس کے بعد سمندر میں پانی کی سطح دو فٹ اونچی ہوجائے گی۔ اور اگر گرین لینڈ کا برفانی تودہ پگھل جائے تو سمندر میں پانی کی سطح 20 فٹ اونچی ہوجائے گی۔ اور اگر انٹارکٹکا کا برفانی ذخیرہ پگھل جائے تو سمندر میں پانی کی سطح 200 فٹ بلند ہوجائے گی۔

Melting glaciers also behind sea-level rise

WASHINGTON: World's shrinking glaciers contributed to almost a third of the sea-level rise between 2003and 2009,a new study has found. While 99%of Earth's land ice is locked up in the Greenland and Antarctic ice sheets, the remaining ice in the world's glaciers contributed just as much to sea rise as the two ice sheets combined from 2003to 2009,researchers say. The research found that all glacial regions lost mass from 2003to 2009,with the biggest ice losses occurring in Arctic Canada, Alaska, coastal Greenland, the southern Andes and the Himalayas. The glaciers outside of the Greenland and Antarctic sheets lost an average of 260billion metric tons of ice annually during the study period, causing the oceans to rise 0.03 inches, or about 0.7millimeters per year. Current estimates predict if all the glaciers in the world were to melt, they would raise sea level by about two feet. In contrast, an entire Greenland ice sheet melt

would raise sea levels by 20 feet, while if Antarctica lost its ice cover, it would rise 200 feet.

یہ صرف ایک سائنسی خبر نہیں، یہ دراصل قربِ قیامت کی خبر ہے۔ یہ سائنسی تحقیق کی زبان سے اُس انتباہ کی تصدیق ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی کے انداز میں فرمایا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ماہ نامہ الرسالہ، اپریل 2007، صفحہ 4)

جدید سائنسی رپورٹ میں جو بات سائنس کی زبان سے کہی گئی ہے، عین وہی بات مذکورہ حدیثِ رسول میں تمثل کی زبان میں بطور پیشین گوئی بتائی گئی ہے۔ یہ پیشگی خبر اب واقعہ بن رہی ہے اور وہ وقت بہت قریب ہے جب کہ یہ واقعہ اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔

اِس تکمیلی مرحلے کا اعتراف اہلِ سائنس بھی کر رہے ہیں۔ البتہ دونوں میں یہ فرق ہے کہ اہلِ سائنس اس کو ایک طبیعی واقعہ کے طور پر ذکر کرتے ہیں، جب کہ پیغمبر نے اُس کو انذار کی زبان میں بیان کیا ہے۔

پیغمبر نے انسان کو متنبہ کیا ہے کہ جب ایسا ہو تو یقین کر لو کہ قیامت کا وقت قریب آ گیا۔ اب انسان کے لیے پہلا دورِ حیات ختم ہو چکا۔ اب خالق کے منصوبے کے مطابق، اُس کے لیے دوسرا دورِ حیات شروع ہونے والا ہے۔ اب ایسا ہونے میں کوئی دیر نہیں۔

مذکورہ قسم کی سائنسی رپورٹوں کے ساتھ میڈیا میں طرح طرح کی خبریں آ رہی ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ اب ہمیں خلائی بستیاں (space colonies) بنانا چاہیے۔ کوئی اعلان کر رہا ہے کہ سیارہ مریخ (Mars) پر پانی کی موجودگی کا امکان ہے، اِس لیے اب انسان کو اپنی اگلی جائے قیام کے طور پر زمین کے بجائے مریخ کا انتخاب کرنا چاہئے، وغیرہ۔

مگر اِس قسم کی تمام باتیں مضحکہ خیز حد تک بے معنی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جیسی مخلوق کے لیے معلوم کائنات میں آبادکاری کے قابل کوئی جگہ نہیں۔

اب انسان کو صرف ایک کام کرنا ہے، وہ یہ کہ وہ خالقِ کائنات کی طرف رجوع کرے، وہ اللہ سے اس کی رحمت کا طلب گار بنے۔

حیاتیاتی ارتقا کا نظریہ

مقابل کے صفحے پر دور پورٹیں درج کی گئی ہیں۔ یہ نظریہ ارتقا کی کچھ حالیہ رسرچ پر مبنی ہیں۔ مگر یہ رسرچ کے نام پر صرف مغالطہ (fallacy) کے واقعات ہیں۔ مگر اس قسم کی مغالطہ آمیز تحقیقات سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ حیاتیاتی ارتقا کے سلسلے میں پہلا سوال یہ تھا کہ زندگی (life) کا آغاز کس طرح ہوا۔ ڈارون نے اپنی کتاب اصل الانواع (The Origin of Species) میں مفروضہ طور پر یہ مان لیا کہ زندگی کا آغاز خدا (God) نے کیا۔ مگر دوبارہ یہ سوال تھا کہ حیاتیاتی ارتقا کے نظریے کے مطابق، عضویاتی ارتقا (organic evolution) کیسے ہوا اور ایک نوع دوسری نوع میں کیسے تبدیل ہوئی۔ مثلاً یہ فرض کیا گیا تھا کہ بکری نے ارتقا کرتے کرتے زرافہ کی صورت اختیار کر لی، مگر بکری اور زرافہ کے بیچ میں بہت سی درمیانی کڑیاں تھیں جو کہ واقعے کی دنیا میں موجود نہ تھیں۔ یہاں یہ مان لیا گیا کہ یہ سب گم شدہ کڑیاں (missing links) ہیں، مگر آج تک گم شدہ کڑی کا نظریہ غیر ثابت شدہ بنا ہوا ہے۔

نظریہ ارتقا کے مطابق، انسان کوئی اسپیشل مخلوق نہیں، وہ حیوانات کی اگلی ترقی یافتہ قسم ہے۔ مگر یہاں یہ سوال تھا کہ انسان تمام حیوانات بشمول چمپینزی سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ یہ اختلاف یا فرق کہاں سے آیا۔ اب ارتقا پسند حضرات یہ دعوی کر رہے ہیں کہ انھوں نے انسان کے اندر ایک نیا جین (gene) دریافت کر لیا ہے۔ اِس مختلف جین کی بنا پر ایسا ہے کہ انسان کے اندر ایسا دماغ ہے جو کسی حیوان کے اندر نہیں۔ انسان کے اندر نطق (speech) کی صلاحیت ہے، اور انسان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ اوزار (tools) بنائے اور ان کو استعمال کرے۔

مگر انسان کے اندر پائی جانے والی امتیازی صلاحیت (distinctive qualities) کی توجیہہ صرف یہ کہہ کر نہیں ہو سکتی کہ انسان کے اندر حیوان سے مختلف ایک امتیازی جین پایا جاتا ہے، کیوں کہ دوبارہ یہ سوال ہے کہ یہ امتیازی جین کہاں سے آیا۔ محض ارتقائی پراسس یا اتفاق (accident) کا لفظ اِس انتہائی پیچیدہ واقعے کی توجیہہ نہیں کر سکتا۔

Gene That Gives us Edge Over Apes Decoded

London: Researchers have discovered a new gene which they say helps explain how humans evolved from chimpanzees. The gene, called miR-941,is carried only by humans and it appeared after humans evolved from apes and played a crucial role in human brain development and could shed light on how we learned to use tools and language. Researchers from the University of Edinburgh compared it to 11 other species of mammals, including chimpanzees, gorillas, mice and rats. This finding, published in Nature Communications, brings us closer to answering one of science's leading questions: What makes the human body different from other mammals? A previous study that also analysed the differences between apes and humans found that the evolutionary genetic advantages that help humans live longer than apes also make them more vulnerable to diseases of ageing, including heart disease, cancer, and dementia. Scientists led by Dr. Martin Taylor at the Institute of Genetics and Molecular Medicine showed that miR-941had an important part in the development of the human brain and can even help explain how we acquire language and learn to use tools. This new gene is the first known gene to be found in humans and not in apes. According to the team, it appears to have a certain purpose in the human body. (*The Times of India,* New Delhi, Nov. 16, 2012 p. 19)

Did genetic accident lead to human intelligence

London: Scientists have discovered the origin of intelligence after identifying a'genetic accident 500million years ago when the genes that enabled humans to think and reason evolved. Researchers led by the University of Edinburgh have discovered how humans and other mammals evolved to have intelligence. They found that intelligence in humans developed as the result of an increase in the number of brain genes in our evolutionary ancestors. Scientists also believe that the same genes that improved our mental capacity are also responsible for a number of brain disorders. The researchers suggest that a simple invertebrate animal living in the sea 500million years ago experienced a'genetic accident,which resulted in extra copies of these genes being made. This animal's descendants benefited from these extra genes, leading to behaviourally sophisticated vertebrates–including humans". One of the greatest scientific problems is to explain how intelligence arose during evolution", professor Seth Grant, of the University of Edinburgh, who led the research, said. (*The Times of India,* New Delhi, Dec. 4, 2012, p. 19)

کم تر اندازہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''آزادیٔ ہند'' (*India Wins Freedom*) میں 1947 کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ آزادی کے بعد انڈیا میں جو پہلی حکومت بنی، اُس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Lord Mountbatten) گورنر جنرل تھے اور سردار ولبھ بھائی پٹیل ہوم منسٹر تھے۔ سردار پٹیل کے حکم پر پولس نے دہلی کے مسلمانوں کے گھروں سے ''ہتھیار'' برآمد کئے۔ اِن ہتھیاروں کو کیبنٹ روم کے چیمبر کی ایک میز پر رکھا گیا۔ سردار پٹیل نے حکومت کے ذمے داروں کو دعوت دی کہ وہ چیمبر میں آکر اِن ہتھیاروں کو دیکھیں جو کہ سردار پٹیل کے دعوے کے مطابق، مسلمانوں نے اِس لیے جمع کئے تھے کہ وہ دلّی سے ہندوؤں اور سکھوں کا خاتمہ کرسکیں۔ مولانا آزاد (وفات: 1958) لکھتے ہیں کہ جب ہم لوگ چیمبر کے اندر داخل ہوئے تو وہاں میز پر کچھ معمولی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ مثلاً باورچی خانے کی چھری، لوہے کے ٹکڑے، وغیرہ۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک چھری اپنے ہاتھ میں اٹھائی اور مسکراتے ہوئے کہا کہ — اُن لوگوں کا فوجی نظریہ بڑا عجیب ہوگا جن لوگوں نے یہ سامان اکھٹا کرکے سمجھا کہ دہلی کے شہر پر اس کے ذریعے قبضہ کیا جاسکتا ہے:

Those who had collected these materials seemed to have a wonderful idea to military tactics if they thought that the city of Delhi could be captured with them. (p. 233)

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ نئے مسائل کے حل کے لیے سب سے پہلے یہ ضرورت ہوتی ہے کہ اس کی نوعیت کو سمجھا جائے۔ مسئلے کی نوعیت کو سمجھے بغیر اُس کے حل کے لیے چھلانگ لگانا ہمیشہ اپنے نتیجہ (result) کے اعتبار سے ناکام ثابت ہوتا ہے، اُس کی وجہ ایک لفظ میں صرف یہ ہوتی ہے — ناقص منصوبہ بندی کے ذریعے ایک حقیقی مسئلے کو حل کرنا۔ دانش مندی کا تقاضا ہے کہ آدمی پہلے بے لاگ جائزہ لے کر مسئلے کی اصل نوعیت کو سمجھے اور پھر نتیجہ خیز منصوبہ بندی کے ذریعے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرے۔

قابلِ کار انسان

دنیا میں بے شمار لوگ ہیں۔ زمین کا ہر گوشہ انسانوں سے بھرا ہوا ہے۔ مگر دنیا میں سب سے زیادہ کمی جس چیز کی ہے، وہ صرف ایک ہے اور وہ ہے قابل کار انسان (competent person)۔

مغل حکمراں اورنگ زیب عالم گیر (وفات: 1727) کا واقعہ ہے۔ ایک بار انھوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ وہ ہاتھ اٹھائے ہوئے خاموش دعا کرتے رہے۔ اُس وقت اورنگ زیب کے پیچھے ان کے وزیر سعد اللہ خان کھڑے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب جب دعا سے فارغ ہوئے تو سعد اللہ خاں نے کہا: عالی جاہ، آپ کی سلطنت کا پرچم کشمیر سے لے کر راس کماری تک لہرا رہا ہے، کیا اِس کے بعد بھی کوئی ارمان ہے جو آپ کے دل میں باقی رہ گیا ہے۔ اورنگ زیب اِس کو سن کر کچھ دیر خاموش رہے۔ اس کے بعد گہرے تاثر کے ساتھ کہا: سعد اللہ، مردے خواہم (سعد اللہ، میں ایک آدمی چاہتا ہوں)۔

اورنگ زیب کا یہ قول بتاتا ہے کہ وہ اصل حقیقت سے صرف ففٹی پرسنٹ واقف تھے۔ اِس معاملے میں اصل بات یہ نہیں تھی کہ اورنگ کے پاس کوئی ''مرد'' نہیں تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ اورنگ زیب نے مرد بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اورنگ زیب نے اپنی ساری عمر مملکت کی توسیع میں صرف کر دی۔ واقعات بتاتے ہیں کہ قابلِ کار انسان کی اہمیت کو نہ تو انھوں نے سمجھا اور نہ اس کو تیار کرنے کے لیے انھوں نے کوئی حقیقی کام کیا۔

یہی حال تقریباً تمام اداروں اور تنظیموں کا ہے۔ ہر ادارے اور تنظیم کو یہ شکایت ہے کہ اس کے پاس افرادِ کار نہیں، مگر کسی کو یہ خبر نہیں کہ اصل غلطی کہاں ہے۔ اصل غلطی یہ ہے کہ تمام لوگ توسیع (expansion) کو کام سمجھتے ہیں، جب کہ اصل کام یہ ہے کہ استحکام (consolidation) کے لیے محنت کی جائے۔ اور افرادِ کار ہمیشہ استحکام پسندی کے ماحول میں بنتے ہیں، نہ کہ توسیع پسندی کے ماحول میں۔

سوال وجواب

سوال

1- مجھے ایک مطالعہ کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ سائنسی علم ایک نامکمل علم ہے جب کہ وحی (قرآن) کا علم ایک مکمل علم۔ سوال یہ ہے کہ ایک نامکمل اور ناقص علم کی مدد سے مکمل علم کی تشریح اور وضاحت کرنا کس حد تک درست ہے۔ سائنس کے ذریعے ہم ہر چیز کی حقیقت کو نہیں جان سکتے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ سائنسی نظریات بدلتے بھی رہتے ہیں۔ اس معاملے کی وضاحت کردیں۔

2- آپ کی تحریروں میں اکثر ایک لفظ ذہنی ارتقا (intellectual development) پڑھنے کو ملتا ہے۔ اس کی وضاحت کردیں کہ اس سے کیا مراد ہے۔

3- فلسفیانہ فکر (philosophical thinking) اور سائنسی فکر (scientific thinking) میں کیا فرق ہے۔ نیز تشکیک (scepticism) کے زیادہ قریب کون سی فکر ہے۔

4- آپ نے اپنی کتاب ''رہنمائے حیات'' کے ایک مضمون ''صحیح طرز فکر'' کے تحت لکھا ہے کہ آج کے انسان کا ذہنی لیول وہی ہے جو ماضی کے انسان کا تھا۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ چوں کہ ماضی کی نسبت موجودہ زمانے میں انسان نے زیادہ ترقی کی ہے، لہذا موجودہ زمانے کے انسان کا ذہنی لیول بڑھا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ انسانی شعور نے زیادہ ارتقا حاصل کیا ہے۔

5- آپ نے اپنے ایک مضمون ''طلاق اسلام میں'' لکھا ہے کہ طلاق کے سلسلے میں ایک حل ''حلالہ'' بھی ہے۔ یعنی آپ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ میرے علم کے مطابق، احادیث میں حلالہ کی ممانعت آئی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کروانے والے کو کرائے کا سانڈ کہا ہے۔ اور علما کی اکثریت بھی اسے ناجائز کہتی ہے۔

6- کیا مرشد کے ہاتھ پر بیعت ضروری ہے۔ کیا مرشد کے بغیر اسلام کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ کیسے پتا چلے کہ کوئی شخص مرشد کے قابل بھی ہے یا نہیں، کیوں کہ ہم اندرونی طور پر اور عقیدے کے لحاظ سے تو کسی کے بارے میں مکمل طور پر نہیں جان سکتے۔

7۔ کیا مسلمان سربراہ کا اصل کام اسلامی حکومت کو قائم کرنا نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو مکہ اِسی مقصد کے تحت فتح کیا تھا، تاکہ وہاں اسلامی نظام قائم کیا جاسکے۔ اور کیا پیغمبر اسلام کا قائم کردہ نظام ایک آئڈیل نظام (ideal system) تھا۔

8۔ قرآن مجید میں شہید کو زندہ کہا گیا ہے۔ اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ انہیں مردہ مت کہو۔ شہید کس معنی میں زندہ ہیں۔ کیا وہ جسمانی طور پر زندہ ہیں یا کسی اور لحاظ سے۔

9۔ جادو کی حقیقت کیا ہے۔ سائنسی طور پر اسے کیسے ثابت کریں گے۔

شخصیت پرستی اسلام میں جائز ہے یا ناجائز۔ کسی نبی یا کسی صحابی کے حوالے سے شخصیت پرستی جائز ہے یا ناجائز۔

11۔ آپ کی آڈیو تقاریر میں نے سنی ہیں اور ایک بات نوٹ کی ہے کہ آپ جب نبی کا نام لیتے ہیں تو ساتھ مختصر درود (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں پڑھتے۔ آپ صرف 'پرافٹ' یا 'رسول اللہ' کہہ کر نام لیتے ہیں۔ کیا نبی کے نام کے ساتھ درود نہیں پڑھنا چاہئے۔

12۔ ایک شخص نے کہا کہ اسلامی سزائیں صرف اُس وقت لاگو ہوں گی، جب ایک سوسائٹی کے اندر اسلامی نظام صحیح معنوں میں نافذ ہو۔ یہاں تک کہ اگر غریب لوگوں کی فلاح کا بندوبست نہیں کیا گیا اور عشر اور زکوۃ کا نظام درست نہیں اور ایسے حالات میں کوئی شخص چوری کرتا ہے تو آپ اس کے ہاتھ نہیں کاٹ سکتے۔ اُس نے مزید کہا کہ ایسا حضرت عمر کے دور میں بھی ہوا تھا اور انھوں نے چور کو سزا نہیں دی تھی۔ برائے مہربانی اس کی وضاحت کریں۔

جواب

1۔ وحی اور سائنس میں جو فرق ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ ایک مکمل ہے اور اور دوسرا نامکمل۔ دونوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ سائنس شہود (seen world) کا علم ہے اور وحی ہم کو غیب

(unseen world) سے باخبر کرتی ہے۔قرآن وحدیث کے مطالعے میں اگر کسی سائنسی تحقیق کا حوالہ دیا جاتا ہے تو وہ اس کی تصدیق کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس کی توجیہہ کے لیے ہوتا ہے۔

2۔ قرآن کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ: لکل آیۃ منھا ظھر و بطن (ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے)۔ جو چیز باطن میں ہے، اُس کو جاننے کا ذریعہ غور وفکر ہے۔ جب آپ غور وفکر کے ذریعے کلام کے باطن تک پہنچتے ہیں تو اِسی کا نام ذہنی ارتقا ہے۔

3۔ فلسفیانہ فکر قیاسی فکر پر مبنی ہوتا ہے اور سائنسی فکر مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے۔تشکیک کی مروّجہ اصطلاح فلسفہ کے ساتھ مخصوص ہے، سائنس میں یہ اصطلاح استعمال نہیں ہوتی۔

4۔ تخلیق کے اعتبار سے، انسانی ذہن آج بھی اُسی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے جیسا کہ وہ قدیم زمانے میں تھا۔ بہ اعتبارِ تخلیق دونوں میں کوئی فرق نہیں۔حیاتیاتی ارتقا کے نظریے کو جو لوگ مانتے ہیں، اُن کی رائے اِس کے خلاف ہے۔لیکن حیاتیاتی ارتقا کا نظریہ صرف ایک مفروضہ ہے، وہ کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں۔

5۔ حلالہ کروانا بلاشبہہ ایک ناجائز فعل ہے، لیکن ''حلالہ'' کی ایک اور قسم ہے جو کہ خود قرآن سے ثابت ہے، اِس کو سمجھنے کے لیے آپ سورہ البقرہ کی آیت نمبر 230 کا مطالعہ فرمائیں۔

6۔ بیعت کا طریقہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔اس کے بعد صحابہ اور تابعین نے اس کی تقلید نہیں کی۔ جہاں تک مرشد کا سوال ہے، مرشد کوئی نام زدگی کا معاملہ نہیں، یہ کسی آدمی کی ذاتی دریافت کا معاملہ ہے۔اگر آپ کو کسی پر اعتماد ہو تو اس کو اپنا مرشد بنا لیجئے۔مرشد کا مطلب صرف دینی رہنما ہے، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

7۔ اسلامی حکومت یا اسلامی نظام کا معروف نظریہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں۔یہ ایک سیاسی بدعت ہے۔اِس موضوع پر راقم الحروف نے بہت زیادہ لکھا ہے۔مزید واقفیت کے لیے آپ اُس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔مثلاً دین وشریعت اور تعبیر کی غلطی، وغیرہ

8۔ موت کے بعد ہر مومن کا وہی انجام ہوتا ہے جو قرآن میں شہید کا بتایا گیا ہے۔

اِس اعتبار سے، مومن اور شہید میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن میں شہید کو سنگل آؤٹ (single out) کرکے یہ بات صرف اِس لیے کہی گئی کہ اُس زمانے میں کچھ لوگ شہادت کی موت کو ''موتِ ضیاع'' کا نام دینے لگے تھے۔

9۔ جادو کی کوئی طلسماتی حقیقت نہیں۔ ہر جادو صرف ایک ٹرک (trick) ہوتا ہے۔ جادو کے معاملے میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے۔

10۔ شخصیت پرستی (personality cult) بلاشبہہ ایک ناجائز فعل ہے۔ شخصیت پرستی اور بت پرستی کے درمیان صرف شکل کا فرق ہے۔ دونوں سے درمیان حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

11۔ پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ ہر بار زبان سے ''صلي الله عليه وسلم'' کہنا ضروری نہیں۔ یہی علما کا مسلک ہے۔

12۔ یہ رائے اصولی طور پر درست ہے۔ اس کا درست ہونا خود قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔

صدر اسلامی مرکز کے آڈیو اور ویڈیو لیکچرز کے لیے حسب ذیل لنکس ملاحظہ ہوں:

www.cpsglobal.org/videos.

.www.alquranmission.org/podcasts.aspx

Rahnuma-e-Zindagi
by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Tuesday-Friday 5.00 am

ISLAM FOR KIDS
by
Saniyasnain Khan/Maria Khan
ETV Urdu
Every Sunday 9.00 am

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2012-14
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2012-14

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

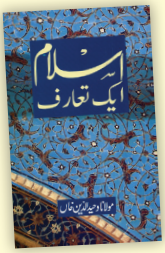

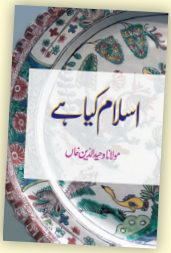

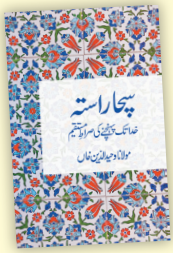

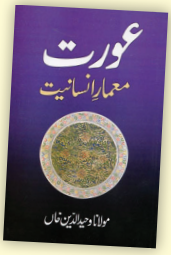

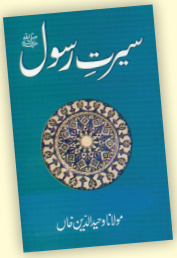

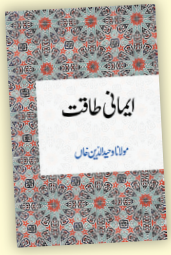

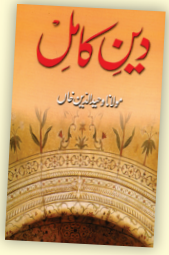

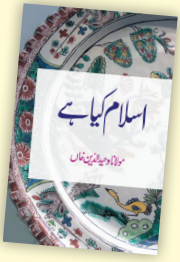

www.goodwordbooks.com